جلد : ۶۲
عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

فروری ۶۵ء

آسان زبان میں اسلامی تعلیمات کا سلسلہ

از ابو سلیم محمد عبد الحیٔ

ایمان کی اہمیت

- ایمان کیا ہے؟
- دین میں ایمان کی کیا اہمیت ہے؟
- کن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے؟
- دین کا شعور اور ایمان و یقین بخشنے والی کتاب
- بچوں اور عورتوں کے لیے نہایت مفید کتاب

قیمت ۲ روپے

اسلام کی تعلیم

- اسلام کیا ہے اور اس کے بنیادی عقائد کیا ہیں؟
- اسلامی عبادات کیسے انجام دی جاتی ہیں؟
- ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟

— اس کتاب میں —

ان سوالوں کا اطمینان بخش جواب ملے گا

قیمت ۱/۷۵ روپے

دین کی حفاظت

- خواتین کی اصلاح و تربیت کیلئے بیش قیمت کتاب
- دین کی حفاظت و بقا کیلئے خواتین کی ذمہ داری
- فساد معاشرہ میں خواتین کو صحیح راہ پر قائم رکھنے کے لیے ضروری تدابیر

قیمت ۱/۷۵ روپیہ

دین کی خدمت

- دین کی خدمت کیوں کی جائے اور کیسے؟
- اس کام کی ضروری شرائط کیا ہیں؟
- غیر اسلامی نظام سے مومن کا تعلق۔
- اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور ان کا حل۔
- آسان اور شگفتہ انداز بیان۔ قیمت ۲/۲۵ روپے

دین کی باتیں

- دین کیا ہے اور کیا چاہتا ہے؟
- اسلام کے بنیادی عقائد کیا ہیں؟
- اسلام کی بنیادی عبادات اور انکی ضروری تفصیلات
- آسان اور عام فہم زبان میں

قیمت ۲ روپے

تبلیغ کی حکمت

- تبلیغ کا صحیح طریقۂ کار کیا ہے؟
- داعی کی ضروری صفات کیا ہیں؟
- مخاطب کی نفسیات کا لحاظ کیسے کیا جائے؟
- دعوتِ دین پیش کرنے کا سلیقہ؟

قیمت ۱/۲۵ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

عدد ۶	فروری ۱۹۶۵ء	جلد ۶۲

سالانہ چندہ — دفتر رسالہ ترجمان القرآن — قیمت فی پرچہ

سات روپے — ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور — ۷۵ پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ملک میں گذشتہ کئی ماہ سے انتخابِ صدارت کے معاملہ میں حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار کے درمیان جو کشمکش ہو رہی تھی وہ فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب کی کامیابی پر منتج ہو چکی ہے یہ انتخاب کس حد تک غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تھا، اس کی تفصیلات سے پورا ملک واقف ہے اس لیے ہم اُن دھاندلیوں اور زیادتیوں کا تذکرہ بالکل لاحاصل سمجھتے ہیں جو اس انتخاب میں کھلے بندوں کی گئیں۔ اُن کا ذکر ایک دلفگار داستان ہی نہیں بلکہ ضمیر پر ایک بوجھ ہے جس سے دل کانپ اٹھتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اُن ہاتھوں سے ہوا جنہیں قوم نے انہیں روکنے کا فرض سپرد کر رکھا تھا۔ جب باڑھ ہی کھیت کو کھانا شروع کر دے تو پھر شکایت کیسی اور شکوہ کا کیا مقام۔ ہم ان حالات میں صرف اللہ ہی سے دعا کر سکتے ہیں۔ وہ مسبب الاسباب غیب سے ملک اور قوم کی بہتری کے سامان پیدا کر دے۔

البتہ اس وقت ہم چند باتیں اپنے رفقاء کار اور اس ملک کے دین پسند طبقوں سے کہنا چاہتے ہیں۔

اپنی مخلصانہ سعی و جہد کے نتائج کو اپنی امیدوں اور توقعات کے خلاف پا کر انسان فطری طور پر دل گرفتہ ہوتا ہے۔ یہ ردِ عمل بالکل قدرتی ہے لیکن اس دل گرفتگی کو کبھی بھی مایوسی کی صورت میں ڈھلنے نہ دینا چاہیے۔ خصوصاً ایک مسلمان کے قلب کے اندر تو یاس و قنوطیت کو کبھی راہ نہ پانی چاہیے۔

ایک مسلمان حیّ و قیّوم، رحیم و کریم، سمیع و بصیر اور مدبر الامر خدائے واحد پر یقین رکھتا ہے
اس بنا پر اُس کے ایمان کا بنیادی اقتضا یہ ہے کہ وہ کارسازِ حقیقی کے فیصلوں پر سرِ تسلیم خم
کر دے۔ اس کی مشیت نے جو فیصلہ کیا ہے وہی صحیح فیصلہ ہے خواہ وہ ہماری پسند یا توقعات
سے کتنا ہی مختلف ہے۔ اللہ کی نظر سب سے زیادہ بالغ اور کائنات کے سارے گوشوں،
اور ماضی، حال اور مستقبل کے سارے اَدوار پر حاوی ہے۔ اس لیے ہمیں دل کی گہرائیوں میں اس
بات پر پُوری طرح مطمئن رہنا چاہیے کہ اُس نے جو کچھ کیا ہے، اسی میں خیر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم
جس بات کے خواہشمند اور متمنی ہیں، اُس میں ہماری بہتری اور بھلائی کے بجائے ہمارا نقصان اور
زیاں ہو اور جو چیز ہماری محدود نظر اور ناقص عقل کے مطابق ہمیں ضرر رساں دکھائی دے رہی ہے
اُسی میں ہمارے لیے بہت سے خیر کے پہلو چُھپے ہوتے ہوں۔

وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ: ۲۱۶)	ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

ایک مسلمان کے لیے کامیابی اور ناکامی کے معیارات اور اعمال کو وزن کرنے کے پیمانے کچھ
دوسرے ہی ہیں۔ جو شخص اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ دنیا کے اس امتحان کے بعد آخرت میں
اُسے اپنی کارگزاری کا پُورا پُورا صلہ ملے گا اور اس معاملے میں اُسے زیادہ سے زیادہ مراعات بھی
حاصل ہونگی اور اُس کی ذرہ برابر حق تلفی بھی نہ کی جائے گی، اُسے یہ کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ
معمولی ناکامی پر دل شکستہ ہو جائے۔ اُس کی کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ خارجی دنیا میں نہیں کیا
جا سکتا بلکہ اُسے اس کا اندازہ کرنے کے لیے دل کی دنیا پر نگاہ ڈالنی چاہیے۔ اُس نے جو نیک
عمل کیا ہے، حق کی سربلندی کے لیے جس قدر مصائب اٹھائے ہیں اور اللہ کی راہ میں جس قدر

ایثار سے کام لیا ہے، اُس کی تہ میں اگر رضائے الٰہی کا جذبہ کارفرما ہے تو وہ کامیاب ہی ہے خواہ دنیاوی نقطۂ نظر سے اُسے شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہو۔ اور اس کے مقابلے میں اگر اسے معمولی سی جدوجہد کے صلے میں دنیا کی کامرانیاں اور فتح مندیاں حاصل ہوگئی ہوں لیکن اس جدوجہد کے محرکات رضائے الٰہی کے علاوہ کچھ دوسرے ہوں تو مسلمان کی نظر میں یہ سراسر ناکامیاں ہیں۔

اس بنا پر ہمارے رفقاء کو اس وقت اپنے دلوں کو ٹٹول کر یہ دیکھنا چاہیے کہ آخر انہوں نے اپنے آرام و آسائش کو تیاگ کر کانٹوں بھری جو دشوار گزار راہ اختیار کی ہے اُس میں اُن کے پیشِ نظر کیا مقصد ہے۔ اگر یہ مقصد محض دنیا کا حصول ہے تو وہ اول تا آخر ناکام ہی ناکام ہیں۔ لیکن اگر ان کا مقصد حق تعالیٰ کی خوشنودی اور اخروی فلاح ہے تو پھر اس طرح کے حادثات کو دیکھ کر انہیں کسی طرح بھی دل شکستہ نہ ہونا چاہیے۔

قرآن مجید میں مسلمان کو صبر کی جو بار بار تلقین کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مومن صرف اسی زادِ راہ کے سہارے تسلیم و رضا کے راستے پر گامزن ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اس متاع سے محروم ہے تو وہ قدم قدم پر یاس و قنوطیت کا شکار ہوگا۔ دین کی راہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ مصائب اور پریشانیوں کی راہ ہے، مخالفتوں اور مخاصمتوں کی راہ ہے، فقر و فاقے کی راہ ہے۔ جس کی منزل اِس دنیا پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اس دنیا سے دُور آخرت میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں اللہ کے پاکباز بندوں کے ایمان اور طرزِ عمل کا ذکر ان بلیغ الفاظ میں کیا گیا ہے:

اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ ۝ وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ

اور اُن کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اُسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ اُن کی روش یہ ہوتی

رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوْءَ الْحِسَابِ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (الرعد ۲۰-۲۲)	ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بُری طرح حساب نہ لیا جائے۔ اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف احیاء علوم الدین میں اس موضوع پر بڑی فکر انگیز بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ صبر کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے رب اور خالق کو پوری طرح جانتا اور پہچانتا ہو۔ کیونکہ جب تک اُس کا اپنے مالک پر ایمان پختہ نہیں ہوتا اس وقت تک وہ اُس کی رضا کے لیے کوئی دکھ بھی اٹھانے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو صبر درحقیقت اللہ رب العالمین پر ایمان کی عملی شہادت ہے۔ اس ضمن میں اُن کے اپنے الفاظ قابلِ غور ہیں:

ولکن الصبر نصف الایمان باعتبارین وعلی مقتضی اطلا قین احدھما ان یطلق علی التصدیقات والاعمال جمیعا فیکون للایما ن رکنان: احدھما الیقین والآخر الصبر والمراد بالیقین المعارف القطعیۃ الحاصلۃ بھدایۃ اللہ تعالیٰ عبدہ الی اصول الدین والمراد بالصبر العمل بمقتضی الیقین	صبر کو دو اعتبار سے نصف ایمان کہا جاتا ہے اور ایمان کے دونوں ہی معنی اس بات کے مقتضی ہیں کہ صبر نصف ایمان ہو۔ اوّل ان معنوں میں کہ ایمان کو تصدیقات یعنی معارف اور اعمال دونوں کے لیے بولا جائے۔ اس صورت میں ایمان کے دو رکن ہوں گے۔ ایک یقین اور دوسرا صبر۔ یقین سے مراد دین کے وہ معارف ہیں جو بندے کو خداوند تعالیٰ کی ہدایت سے حاصل ہوتے ہیں اور صبر سے مقصود عمل کرنا ہے یقین سے انسان کے اندر

يعرفه ان المعصية ضارة والطاعة نافعة ولايمكن ترك المعصية و المواظبة على الطاعة الا بالصبر (جلد ۴ ص۶۱)	گناہ کے مضر اور طاعت کے مفید ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ صبر کے ذریعہ انسان معصیت کو ترک اور اطاعت میں مداومت اختیار کر سکتا ہے۔

نتائج سے بے پروا ہو کر راستی اور صداقت کی راہ پر مستقل قائم رہنا اُسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کو اپنے خالق و مالک کی ذات پر پورا پورا اعتماد ہو اور اُسے اس بات کا پورا یقین ہو کہ اس نے جس راہ کو اختیار کر رکھا ہے وہی فوز و فلاح کی راہ ہے اور صرف یہی ایک راہ اُسے اپنے حقیقی مقصد تک پہنچا سکتی ہے۔ جن خوش نصیب حضرات کے قلب و دماغ میں خداوند تعالیٰ کے بارے میں یہ غیر متزلزل ایقان اور اُس کے نازل کردہ دین کے متعلق یہ پختہ یقین پیدا ہو جاتا ہے انہیں نہ تو کنارہ چھوٹنے کا غم ستاتا ہے اور نہ مخالفتوں اور مخاصمتوں کے طوفان ہی انہیں مضمحل کرنے پاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (الاحقاف۔ آیت ۱۳)	بے شک جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ اس پر جمے رہے تو انہیں نہ تو کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غم ہی کھائیں گے۔

اس سلسلے میں ایک ضروری چیز یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اسلام میں صبر کی اصطلاح اپنے ایک مخصوص معنی اور مزاج رکھتی ہے۔ یہاں صبر سے مراد وہ رواقی لاپروائی (STOICISM) نہیں ہے جو ہمیں اہلِ روما اور اُن کی تقلید میں آج کی مغربی قوموں میں نظر آتی ہے یعنی انسان ایک مغرورانہ احساس کے ساتھ ہر قسم کے مصائب اور تکلیفات کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرے۔ یہ اندازِ فکر بالکل غیر فطری ہے اور اس سے انسان کے اندر تکبر اور نخوت کے احساسات پرورش

پلتے ہیں مصیبت بہرحال مصیبت ہے اور اس کے فطری اثرات سے اغماض برتنا اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ چنانچہ رواقی اندازِ فکر شخصیت کی تعمیر میں ممد و معاون ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے انسان کے بہت سے مفید احساسات مضمحل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے ہمیں جس صبر کی تلقین کی ہے اس سے ایک تو انسان کے فطری احساسات کو نشوونما پانے کا موقع ملتا ہے اور دوسرے اس کے اندر غرور اور تکبر کی جگہ رجوع الی اللہ کا شوق بڑھتا ہے۔ چنانچہ اسلام ایک انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ جب کبھی بھی مصیبت اور ناکامی سے دوچار ہو تو اسے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا نتیجہ سمجھے، مالک الملک کے سامنے اُسے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا احساس اور شعور پیدا ہو۔ اور ناکامی کی چوٹ کو مغرورانہ احساس کے ساتھ نظر انداز کرنے کے بجائے وہ اس ذات کو راضی کرنے کے لیے بے تاب ہو، جس کے ہاتھ میں نفع و نقصان کی کلید ہے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی نہایت واضح الفاظ میں صراحت فرمائی ہے:

اِسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْا (الاعراف - ۱۲۸) اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔

یعنی تمہارا صبر کسی مغرورانہ احساس کا نتیجہ نہ ہو بلکہ اُس صبر میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قوت اور اس کی تائید اور نصرت کی شدید ضرورت کا گہرا شعور رہو۔

پھر ایک دوسرے مقام پر یہ فرمایا ہے:

وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (الانفال - ۴۶)	صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یعنی تمہاری مستقل مزاجی، استقامت اور نقصان و تکلیف پر تمہارا صبر تمہاری اپنی کسی ذاتی قوت یا قابلیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راہِ حق کی مشکلات کو پامردی سے برداشت کرنے والوں کی قدم قدم پر معاونت اور دستگیری کرتا ہے:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَلَا تَكُ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا	صبر سے کام کیے جاؤ۔ اور تمہارا یہ صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ ان لوگوں کی حرکات پر رنج نہ کرو

يَمْكُرُوْنَ (النحل - ۱۲۸) اور نہ ہی ان کی چالبازیوں پر دل گرفتہ ہو۔

ایک دوسرے مقام پر اس حقیقت کی وضاحت یوں فرمائی:

اَلَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۔ (النحل - ۴۲)

جنہوں نے صبر کیا اور جو اپنے رب کے بھروسے پر کام کر رہے ہیں۔

یعنی اُن کی ہمت، اُن کا عزم اور استقلال اُن کا کوئی ذاتی جوہر نہیں بلکہ اپنے رب پر توکل اور اعتماد کا ثمرہ ہے۔ پھر قرآن مجید ایک مسلمان کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کرتا ہے کہ صبر کا وصف محض ایک نظریۂ حیات کو اپنانے یا زندگی کے متعلق ایک خاص طرزِ فکر اختیار کرنے ہی سے پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی پرورش اور صحت مند نشو و نما کے لیے ہمیں اُن تمام ذرائع کو اختیار کرنا چاہیے جو اللہ پر یقین پیدا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ان سارے ذرائع میں سے سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ یادِ الٰہی ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۔ (طٰہٰ - ۱۳۰)

جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اُن پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اُسی کی تسبیح کرو، سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی۔ شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔

قرآن مجید میں ایک جگہ نہیں بلکہ کئی مقامات پر صبر اور صلوٰۃ کا یکجا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۔ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (سورہ البقرہ - ۴۵)

یعنی صبر اور صلوٰۃ سے مدد حاصل کرو بلاشبہ نماز ایک سخت مشکل کام ہے، مگر خدا سے ڈرنے والوں کے لیے نہیں۔

امام غزالیؒ نے صبر کی بحث میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ صبر کی ضرورت مصیبت کے وقت

ہی پیش نہیں آتی بلکہ اس کی سب سے زیادہ احتیاج اُن لوگوں کو بھی ہوتی ہے جن کے پاس مال ومتاع کی فراوانی ہو، عز وجاہ کے اونچے اور بلند مناصب ہوں اور انہیں اپنے مقاصد میں کامیابی اور کامرانی نصیب ہو۔ ان حالات میں انسان میں بالکل فطری طور پر غرور اور تکبر کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور شیطان اُس کے اندر گھس کر بڑی آسانی کے ساتھ اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور طغیان کے راستے پر ڈال دیتا ہے آپ اس سلسلے میں اُس عارفِ ربانی کی تصریحات ملاحظہ فرمائیں:

"بندۂ مومن کو ہر حال میں صبر کرنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان عام طور پر زندگی میں دو قسم کے حالات سے گزرتا ہے۔ یا تو اس کی خواہشوں اور تمناؤں کی تکمیل ہوتی ہے یا ان میں اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ موافق حالات کی صورت یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ صحت، تندرستی، مال وجاہ جیسی نعمتیں کثرت کے ساتھ عطا فرمائے۔ ان نعمتوں کی فراوانی اُس کے لیے بڑی آزمائش ہے۔ وہ ان میں کھو کر اپنے مالک سے سرکشی کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہ چیز انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ جب اپنے آپ کو غیر مسئول اور بے نیاز سمجھنے لگتا ہے تو وہ گمراہی کے راستے پر پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىٓ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى۔ اسی آیت کی تشریح کرتے ہوئے بعض عارفین نے کہا ہے: البلاء یصبر علیه المؤمن والعوافی لا یصبر علیها الا الصدیق۔ بلا پر تو ہر بندۂ مومن صبر کرتا ہے لیکن عافیت پر صبر کرنا صرف صدیق کا کام ہے۔ اور حضرت سہیل فرماتے ہیں کہ عافیت اور فراوانی پر صبر کرنا مصیبت پر صبر کرنے کی بہ نسبت زیادہ مشکل ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جب دنیاوی نعمتوں کی بارش ہوئی تو انہوں نے ارشاد فرمایا: "جس وقت فقر وفاقہ سے ہماری آزمائش کی گئی تو ہم نے صبر کیا۔ مگر جب فتنۂ تونگری میں ہم مبتلا ہوئے تو اُس معیار کو برقرار نہ رکھ سکے جو ضروری تھا۔"

(احیاء علوم الدین جلد ۴ ص ۶۷-۶۸)

ہم جہاں اپنے رفقاء کار کو صبر اور تسلیم و رضا کی تلقین کرتے ہیں وہاں ہم صداقتی انتخاب جیتنے والے حضرات سے بھی یہ عرض کرتے ہیں کہ وہ براہِ کرم اپنی اس فتح مندی پر نازاں ہونے اور غرہ کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اُس پروردگار عالم نے انہیں سنبھلنے، اپنی روش پر نظرِ ثانی کرنے اور اپنے طرزِ عمل کو بدلنے کا مزید ایک موقع دیا ہے۔ دنیا کی عارضی کامیابیاں لازمی طور پر حق و صداقت کی فتح کی علامت ہی نہیں ہوتیں بلکہ کبھی اللہ تعالیٰ اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت کسی فرد یا گروہ پر انعام و اکرام کی بارش کر کے یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس نے اپنے مالک کا کس حد تک شکر ادا کیا ہے اور کبھی اُسے دنیاوی نعمتوں سے پوری طرح نواز کر اُسے اس امر کی کھلی چھٹی دے دیتا ہے کہ وہ سرکشی اور بغاوت میں اپنے دل کے پورے ارمان نکال لے اور اپنے عمل سے پوری طرح ثابت کر دے کہ اس کے اندر خدا ترسی کا کوئی جوہر باقی نہیں رہا۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ (الانعام رکوع ۲۰)

وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیئے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللَّهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُم بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ

(یونس رکوع ۲)

اگر کہیں اللہ لوگوں کے ساتھ بُرا معاملہ کرنے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی وہ ان کے ساتھ بھلائی کرنے میں جلدی کرتا ہے تو اُن کی مہلتِ عمل کبھی کی ختم کر دی گئی ہوتی (مگر ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے) اس لیے ہم اُن لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اُن کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

بطنِ مستقبل میں جو کچھ پنہاں ہے اُس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا غیب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ ہم ان مصلحتوں کو بھی سمجھنے سے قاصر ہیں جن کے تحت خداوند تعالیٰ نے موجودہ حکمرانوں کو حکومت کے مزید مواقع عطا کیے ہیں البتہ ہم ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ ان حضرات کو تلافیٔ مافات کا ایک نہایت ہی نادر موقع ملا ہے۔ وہ جن طریقوں اور حربوں سے کامیاب ہوئے ہیں ان کا انہیں پوری طرح علم ہے۔ اخبارات میں وہ جس قسم کے چاہیں بیانات دیتے رہیں اُن کی زبان پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی لیکن شاید اُن کی آنکھوں سے یہ حقیقت اب بالکل اوجھل نہیں رہی کہ وہ عوامی تائید سے محروم ہیں۔

اس تلافی کی ہمارے نزدیک بہترین صورت یہ ہے کہ وہ اپنے حاشیہ برداروں اور خوشامدیوں کے نرغے سے نکل کر ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کا جائزہ لیں، قوم کے دل کی دھڑکنوں کو خود اپنے کانوں سے سُنیں اور اپنی آنکھوں سے اُس کے چہرے کے اُن نقوش کا مشاہدہ کریں جو ایک شدید کرب اور گہرے اضطراب کی زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں۔ آخر غور کیجیے کہ کیا اس قوم نے جان و مال اور عزت و آبرو کی بے مثال قربانیاں دے کر اس خطۂ ارضی کو محض اسی لیے حاصل کیا تھا کہ بدیشی آقاؤں کی جگہ کچھ دیسی آقا اس کی گردن پر مسلط ہو جائیں، اس کے اپنے ملک میں اس کا دین مظلوم بن کر رہ جائے، اس پر حکومت انہیں ظالمانہ اور جابرانہ قوانین کے ذریعے کی جائے جو غیر ملکی قوم نے محض اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کے لیے وضع کر رکھے تھے؟

مسلمان قوم بے شعور بھیڑوں کا کوئی گلّہ نہیں جسے لاٹھی کے زور سے ہر طرف ہانکا جا سکتا ہو۔ یہ جیتے جاگتے اور باشعور انسانوں کی ایک ایسی منظم جماعت ہے جو اگرچہ اس دور میں پس کر رہ گئی ہے، تاہم اپنا ایک شاندار اور درخشاں ماضی رکھتی ہے جس کا زندگی کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کے بارے میں ایک خاص اندازِ فکر اور ایک مخصوص زاویۂ نگاہ ہے، جو ایمان، ضمیر اور اخلاق کے متعلق اپنے ایک مخصوص مزاج کی مالک ہے جس کے سینے میں آج بھی اسلام کی محبت کی چنگاریاں موجود ہیں، جو اگرچہ حرص و آز کی خاک کے ڈھیر میں دب کر رہ گئی ہیں لیکن ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئیں۔

جونہی دین پر ضرب پڑتی ہے یہ فوراً بھڑک اٹھتی ہیں۔

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ آج تک جس فرد یا گروہ نے بھی اس قوم کے مخصوص مزاج کو سمجھنے میں کوتاہی کی ہے اُس نے اپنا اور اس ملّت کا زبردست نقصان کیا ہے۔ اس بنا پر ہم موجودہ حکمرانوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس تاریخی حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر کوئی قدم اٹھائیں۔ اُن سے اس معاملہ میں پہلے جو کوتاہیاں ہو چکی ہیں ان کے تلخ نتائج کا اندازہ وہ سالیہ انتخابات میں کسی حد تک لگا چکے ہوں گے اس لیے انہیں اب ان غلطیوں کا اعادہ نہ کرنا چاہیے بلکہ قوم اور ملک کی بہتری اور خود اپنی بھلائی کے پیشِ نظر انہیں اُس ظلم و استبداد اور ان سماجی ناانصافیوں سے دامن بچانا چاہیے جنہوں نے ہماری قومی زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم اور ضروری چیز یہ ہے کہ اسلام کے واضح احکامات کی جو خلاف ورزیاں اب تک کی جاتی رہی ہیں اور فسق و فجور اور فواحش کی جو سرپرستیاں ہوتی رہی ہیں اُن سے فوری طور پر دستکش ہو جانے ہی میں اُن کی عزّت کا راز مضمر ہے۔ یہ سارے اقدام اگرچہ سلبی نوعیت کے ہیں اور ان سے وہ بلند اور پاکیزہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جن کے حصول کے لیے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے۔ تاہم ہمیں امید ہے کہ یہ سلبی اقدام بھی اس سحر کے طلوع ہونے میں ممد و معاون ثابت ہوں گے جس کی آرزو میں لاکھوں انسانوں نے تقسیمِ ملک کے وقت جانیں دی تھیں۔ دوسری طرف ان اقدامات سے بدگمانی کا وہ سلسلہ ختم ہونا شروع ہو جائیگا جو برسرِ اقتدار گروہ کے خلاف ملک کے طول و عرض میں پایا جاتا ہے یا کم از کم وہ نفرت و بیزاری کی شدت تو باقی نہ رہے گی جو پچھلے تین چار مہینوں سے سارے ملک میں یہ حضرات خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔

بے جا نہ ہو گا کہ ان گزارشات کے ساتھ اربابِ اختیار کی خدمت میں ہم یہ بات بھی عرض کر دیں کہ سماج دشمن عناصر خواہ انتخابات میں کتنے ہی مفید اور کار آمد کیوں نہ ہوں لیکن یہ ملک اور قوم کے لیے کسی طرح بھی فائدہ مند نہیں ہوتے۔ عارضی اور وقتی فائدوں کے لیے انہیں جس طرح

کھلی چھٹی دی جا رہی ہے اور ان کو بے تحاشا مسلح کیا جا رہا ہے، یہ انتہائی خطرناک ہے۔ ان کے حوصلے جس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بڑھ رہے ہیں، اگر ان کا کوئی فوری اور مؤثر تدارک نہ کیا گیا تو یہ یقیناً نہ صرف ملک اور قوم کے لیے شدید عذاب کا باعث ہوں گے بلکہ خود آپ کی عزت و آبرو بھی ان کے ہاتھ سے محفوظ نہ رہ سکے گی۔ جو شخص یا گروہ خود اپنا دشمن بن کر غنڈہ گردی کو اپنی زندگی کا شعار بنا لیتا ہے، اس سے یہ توقع کرنی کہ مفادات کے تبدیل ہونے کے ساتھ ہی وہ آپ کی دشمنی پر آمادہ نہ ہو جائے گا، پرلے درجے کی سادگی بلکہ کم فہمی ہے۔ اس لیے خدارا ملک پر رحم کیجیے اور ان لوگوں کی پیٹھ ٹھونکنے اور ان کی "خدماتِ جلیلہ" سے فائدہ اٹھانے کے بجائے ملک اور قوم کے لیے کوئی تعمیری کام کر کے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کیجیے۔ ان بدقماش افراد کی اس وقت جس طرح سرپرستی کی جا رہی ہے اس سے ممکن ہے آپ کو وقتی طور پر کچھ فائدہ پہنچ جائے، لیکن اس عاقبت نااندیشانہ طرزِ عمل سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے جن کے نتیجے میں شرافت اور نیکی پس کر رہ جائے گی اور پورا ملک لاقانونیت کی لپیٹ میں آجائے گا۔ ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اپنی مخصوص اغراض کی برآری میں آپ اس حد تک کھو چکے ہیں کہ اس غلط طرزِ عمل کے بداثرات تک آپ کی نگاہ نہیں پہنچ رہی۔ قومیں شرافت، نیکی، صبر و تحمل اور بُردباری سے پنپتی ہیں، غنڈہ گردی اور ضمیر فروشی سے پروان نہیں چڑھتیں۔ جس فرد، گروہ یا قوم نے بھی انہیں پرورش کرنے کا موقع دیا ہے اُس نے خود اپنی موت کو دعوت دی ہے۔

ہم اس ضمن میں اس ملک کے شہریوں سے بھی یہ اپیل کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بھی خدا کے لیے اس تشویشناک صورتِ حال پر غور کریں اور اس معاملے میں غیر متعلق تماشائی بن کر زندگی نہ گزاریں۔ غنڈہ گردی کا جو سیلاب یہاں بڑی سرعت کے ساتھ امڈ رہا ہے اس سے اگر آج آپ کی ذات، آپ کا خاندان اور گھر محفوظ ہیں تو اس امر کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ کل اس کی زد میں آنے والے نہیں ہیں۔ اس سیلاب کے بند اگر ایک مرتبہ ٹوٹ گئے تو پھر نہ کسی کی جان بچے گی نہ عزت و آبرو۔

اس لیے اس ملک کے ہر حساس، ذی شعور اور دردمند شہری کو ابھی سے اس کے روکنے کی فکر کرنی چاہیے۔ اس کی سب سے زیادہ مؤثر صورت یہ ہے کہ شرفا کے اندر جذبۂ تعاون اور ہمدردی پیدا ہو۔ ایک کا گھر لٹتا دیکھ کر دوسرا چین اور آرام سے نہ بیٹھا رہے۔ اگر چند سماج دشمن عناصر باہم مل کر ملک کی پوری معاشرتی زندگی کو عذاب بنا سکتے ہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ شریف شہریوں کا اتحاد و اتفاق ان کا تدارک کرنے میں ناکام رہے۔

ہمیں یقین ہے کہ یہاں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں جو اس بات کا خواہشمند ہو کہ اُس کی جان و مال اور عزت و آبرو کو ہر وقت خطرہ لاحق رہے۔ جو لوگ آج ان عناصر کو شہ دے رہے ہیں وہ بھی اس بات کو کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ ان عناصر کی "کارگزاری" کا رُخ خود اُن کی اپنی ذات کی طرف پلٹ جائے۔ جان و مال کی حفاظت اور عزت و آبرو کی پاسبانی انسان کا فطری جذبہ ہے۔ کوئی شخص بھی خوف و ہراس کے ماحول میں زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے ملت کے تمام افراد کا یہ فرض ہے کہ وہ نظریات کے اختلاف کے باوجود ان سماج دشمن عناصر کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں۔

ملک میں اغوا، ڈکیتی اور قتل و غارت کی بڑھتی ہوئی وارداتیں ایک نہایت مہیب طوفان کا پتہ دے رہی ہیں۔ اگر اس کے سدِباب کے لیے بروقت مؤثر تدابیر اختیار نہ کی گئیں تو درسگاہوں، بازاروں اور اجتماعی زندگی کے دوسرے مراکز میں ہمارا اور ہماری اولاد کا جو حشر ہوگا وہ تو خیر ہوگا ہی۔ گھر کی چار دیواری میں بھی کسی خاندان کی عزت و آبرو محفوظ نہ رہ سکے گی۔

حالیہ صدارتی انتخابات میں جماعت اسلامی پاکستان اور اُس کے امیر نے جو موقف اختیار کیا اُسے گزشتہ چند ماہ سے جس طرح ہدفِ تنقید بنایا جا رہا ہے، اس کا یہ پہلو بڑا تکلیف دہ ہے کہ اس میں بعض دیندار حلقوں نے اس احساسِ ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا جس کی ان سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی۔ اختلاف رائے

کوئی قابلِ نفرت چیز نہیں بشرطیکہ اس میں انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور اس کے پیچھے خیر خواہی کا جذبہ کارفرما ہو۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جماعت اسلامی اور بالخصوص اس کے امیر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی پر تنقید کرتے وقت بہت سے علمائے دین تنقید کے اُن آداب اور اُس حزم و احتیاط کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں جس کا وہ صبح و شام پرچار کیا کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی کو یہ موقف کن ناگزیر حالات کے تحت اور کن دینی مصالح کی خاطر اختیار کرنا پڑا اُس کا ذکر اس قرارداد میں موجود ہے جو جماعت کی مجلس مشاورت نے اس موقع پر جبکہ مولانا جیل میں تھے منظور کی تھی اور جس کی مزید وضاحت ترجمان القرآن کے گزشتہ شمارے میں کر دی گئی ہے۔

جن حضرات کو مولانا یا جماعت اسلامی کے اس فیصلے سے شرعی اعتبار سے اختلاف تھا اور وہ اس فیصلے کو دلائل سے غلط ثابت کرنا چاہتے تھے اُن کے لیے معقول روش یہ تھی کہ قلم کو حرکت میں لانے سے پیشتر اُن تصریحات کو ذہن میں رکھتے جو جماعت نے اِس ضمن میں پیش کی ہیں۔ لیکن یوں نظر آتا ہے کہ ان حضرات کو کسی شرعی مسئلہ کی تنقیح و وضاحت سے زیادہ اس بات کی فکر دامنگیر تھی کہ کسی طرح مولانا کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے کے اس زرّیں موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے اور اگر مولانا کے موقف پر شرعی زاویۂ نگاہ سے کوئی گرفت نہ کی جا سکتی ہو تو ان کی طرف بعض ایسی باتیں منسوب کر دی جائیں جو طعن و تشنیع کے لیے مواد فراہم کر سکیں۔

آپ ان حضرات کی تحریروں کا اگر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے الزامات کی بنیاد اُن بیانات پر رکھی گئی ہے جو اخبارات میں مولانا کی طرف منسوب کیے گئے تھے۔ حالانکہ جو کوئی مولانا کے طرزِ کلام سے واقف ہے وہ بادنیٰ تامّل ان بیانات کو دیکھ کر سمجھ سکتا تھا کہ یہ ٹھیک مولانا کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ نامہ نگار کے الفاظ ہیں۔ پھر یہ حقیقت بھی کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں کہ اخباری رپورٹیں کبھی بھی پوری صحت کے ساتھ مرتب نہیں کی جاتیں۔ ان میں اخبارات کی پالیسی کو بہت کچھ عمل دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا کی تقریروں کا یہی حشر ہوا۔ وہ اخبارات جو مولانا کے خلاف اُدھار کھائے بیٹھے تھے انھوں نے جان بوجھ کر اُن کے بیانات کو توڑ مروڑ کر شائع کیا۔ باقی رہے وہ اخبارات جنہیں مولانا

سے کوئی پرسش نہ تھی اُن کے لیے بھی کسی فقہی مسئلے کو اُس چچی تلی اور محتاط زبان میں بیان کرنا مشکل تھا جو فقہ میں استعمال کی جاتی ہے۔ ایک طرف یہ دقتیں تھیں اور دوسری طرف یہ بات بھی عملاً ناممکن تھی کہ مولانا ہر روز ان اخباری رپورٹوں کی تردید کرتے رہیں اور اگر وہ کرنا بھی چاہتے تو کہاں تک کر سکتے تھے۔ پھر جو حضرات اخبار نویسی کا کچھ تجربہ بھی رکھتے ہیں، انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اخبارات اپنے کسی شاف رپورٹر کی مرتب کردہ خبر کی تردید کرنے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ جو حضرات مولانا کو بدنام کرنے پر تُلے بیٹھے تھے انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور نامہ نگاروں کی غیر محتاط رپورٹوں کو بنیاد بنا کر اُن پر برسنا شروع کر دیا اور اس معاملے میں بعض حضرات نے تو یہ غضب کیا کہ اخبار میں شائع ہونے والی رپورٹوں کو بھی پوری طرح نقل کر کے تنقید نہیں کی بلکہ ان میں سے ایک آدھ فقرہ نکال کر اس پر ایک پورا مضمون لکھ دیا ہے۔ ہم اس سلسلے میں صرف اسی قدر کہنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کی فن کاریاں دنیا داروں کو تو زیب دیتی ہیں مگر اُن حضرات کو زیب نہیں دیتیں جو اللہ اور رسول کی تعلیمات کے امین ہیں۔

تفہیم القرآن

الشّوریٰ

(۲)

تمہارے[۱۳] درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو، اُس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے[۱۴] - وہی اللہ[۱۵] میرا

۱۳؎ اس پورے پیراگراف کی عبارت اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے، لیکن اس میں متکلم اللہ تعالیٰ نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ گویا اللہ جلّ شانہٗ اپنے نبی کو ہدایت دے رہا ہے کہ تم یہ اعلان کرو۔ اس طرح کے مضامین قرآن مجید میں کہیں تو قُل (اے نبی کہو) سے شروع ہوتے ہیں، اور کہیں اس کے بغیر ہی شروع ہو جاتے ہیں، صرف اندازِ کلام بتا دیتا ہے کہ یہاں متکلم اللہ نہیں بلکہ اللہ کا رسول ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر تو کلام اللہ کا ہوتا ہے اور متکلم اہلِ ایمان ہوتے ہیں، جیسے مثلاً سورۂ فاتحہ میں ہے، یا متکلم فرشتے ہوتے ہیں، جیسے مثلاً سورۂ مریم، آیت ۶۴-۶۵ میں ہے۔

۱۴؎ یہ اللہ تعالیٰ کے مالکِ کائنات اور ولیِ حقیقی ہونے کا فطری اور منطقی تقاضا ہے جب مالک وہی اور ولایت اُسی کی ہے تو لامحالہ پھر حاکم بھی وہی ہے اور انسانوں کے باہمی تنازعات و اختلافات کا فیصلہ کرنا بھی اُسی کا کام ہے۔ اِس کو جو لوگ صرف آخرت کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں، وہ غلطی کرتے ہیں۔ کوئی دلیل اِس امر کی نہیں ہے کہ اللہ کی یہ حاکمانہ حیثیت اِس دنیا کے لیے نہیں بلکہ صرف موت کے بعد کی زندگی کے لیے ہے۔ اِسی طرح جو لوگ اِس دنیا میں صرف عقائد اور چند "مذہبی" مسائل تک اسے محدود قرار دیتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ عام ہیں اور وہ صاف صاف علی الاطلاق تمام نزاعات و اختلافات میں اللہ کو فیصلہ کرنے کا اصل حق دار قرار دے رہے ہیں۔ ان کی رو سے اللہ جس طرح آخرت کا مالکِ یوم الدین ہے اسی طرح اس دنیا کا بھی احکم الحاکمین ہے۔ اور جس طرح وہ اعتقادی اختلافات میں یہ طے کرنے والا ہے کہ

رب ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا، اور اُسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں[16]۔ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے، اور اسی طرح جانوروں

حق کیا ہے اور باطل کیا، ٹھیک اُسی طرح قانونی حیثیت سے بھی وہی یہ طے کرنے والا ہے کہ انسان کے لیے پاک کیا ہے اور ناپاک کیا، جائز اور حلال کیا ہے اور حرام و مکروہ کیا، اخلاق میں بدی و زشتی کیا ہے اور نیکی و خوبی کیا، معاملات میں کس کا کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے، معاشرت اور تمدن اور سیاست اور معیشت میں کونسے طریقے درست ہیں اور کونسے غلط۔ آخر اسی بنیاد پر تو قرآن میں یہ بات اصولِ قانون کے طور پر ثبت کی گئی ہے کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء - ۵۹)، اور مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب - ۳۶)، اور اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ (الاعراف - ۳)

پھر جس سیاق و سباق میں یہ آیت آئی ہے اُس کے اندر یہ ایک اور معنی بھی دے رہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اختلافات کا فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کا محض قانونی حق ہی نہیں ہے جس کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کافر و مومن ہونے کا مدار ہے، بلکہ اللہ فی الواقع عملاً بھی حق اور باطل کا فیصلہ کر رہا ہے جس کی بدولت باطل اور اس کے پرستار آخر کار تباہ ہوتے ہیں اور حق اور اس کے پرستار سرفراز کیے جاتے ہیں، خواہ اِس فیصلے کے نفاذ میں دنیا والوں کو کتنی ہی تاخیر ہوتی نظر آتی ہو۔ یہ مضمون آگے آیت ۲۴ میں بھی آرہا ہے، اور اِس سے پہلے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر گزر چکا ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۴۵۳ - ۴۶۵ - ۴۶۶ - ۴۷۹ - ۴۸۳ - ۴۸۴ تا ۴۸۶ - ۶۳۸ - جلد سوم، ص ۱۵۱ - ۱۵۲ - ۱۶۱)

[15] یعنی جو اختلافات کا فیصلہ کرنے والا اصل حاکم ہے۔

[16] یہ دو فعل ہیں جن میں سے ایک بصیغۂ ماضی بیان کیا گیا ہے اور دوسرا بصیغۂ مضارع جس میں استمرار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ صیغۂ ماضی میں فرمایا "میں نے اُس پر بھروسہ کیا"، یعنی ایک دفعہ میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر لیا کہ جیتے جی مجھے اسی کی مدد، اُسی کی رہنمائی، اُسی کی حمایت و حفاظت، اور اسی کے فیصلے پر اعتماد کرنا ہے۔ پھر صیغۂ مضارع میں فرمایا "میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں"، یعنی جو معاملہ بھی

میں بھی اُنہی کے ہم جنس ، جوڑے بنائے ، اور اِس طریقہ سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے ۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں[17] وہ سب کچھ سُننے اور دیکھنے والا ہے[18]، آسمانوں اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں ، جسے چاہتا ہے کھُلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے ۔ اُسے ہر چیز کا علم ہے[19]

مجھے اپنی زندگی میں پیش آتا ہے ، میں اس میں اللہ ہی کی طرف رجوع کیا کرتا ہوں ۔ کوئی مصیبت ، تکلیف یا مشکل پیش آتی ہے تو کسی کی طرف نہیں دیکھتا ۔ اُس سے مدد مانگتا ہوں ۔ کوئی خطرہ پیش آتا ہے تو اُس کی پناہ ڈھونڈھتا ہوں اور اس کی حفاظت پر بھروسا کرتا ہوں ۔ کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو اُس سے رہنمائی طلب کرتا ہوں اور اس کی تعلیم و ہدایت میں اُس کا حل یا حکم تلاش کرتا ہوں ۔ اور کسی سے نزاع ہوتی ہے تو اُسی کی طرف دیکھتا ہوں کہ اُس کا آخری فیصلہ وہی کریگا اور یقین رکھتا ہوں کہ جو فیصلہ بھی وہ کرے گا وہی حق ہوگا ۔

[17] اصل الفاظ ہیں لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ " کوئی چیز اُس کے مانند جیسی نہیں ہے " ۔ مفسرین اور اہل لغت میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس میں لفظ مثل پر کاف (حرفِ تشبیہ) کا اضافہ محاورے کے طور پر کیا گیا ہے جس سے مقصود محض بات میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے ، اور عرب میں یہ طرز بیان رائج ہے ۔ مثلاً شاعر کہتا ہے وقتلی کمثل جذوع النخل ۔ اور ایک دوسرا شاعر کہتا ہے ما ان کمثلہم فی الناس من احد ۔ بعض دوسرے حضرات کا قول یہ ہے کہ اُس جیسا کوئی نہیں کہنے کے بجائے اُس کے مثل جیسا کوئی نہیں کہنے میں مبالغہ ہے ، مراد یہ ہے کہ اگر بفرضِ محال اللہ کا کوئی مثل ہوتا تو اُس جیسا بھی کوئی نہ ہوتا ، کجا کہ خود اللہ جیسا کوئی ہو ۔

[18] یعنی بیک وقت ساری کائنات میں ہر ایک کی سن رہا ہے اور ہر چیز کو دیکھ رہا ہے ۔

[19] یہ دلائل ہیں اِس امر کے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کیوں ولی برحق ہے ، اور کیوں اسی پر توکل کرنا صحیح ہے اور کیوں اسی کی طرف رجوع کیا جانا چاہیے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم ، صفحات ۵۸۹ تا ۵۹۰ - ۷۴۲ تا ۷۴۶)

اُس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اُس نے نُوحؑ کو دیا تھا، اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے، اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسٰیؑ اور عیسٰیؑ کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اِس دین کو اور اُس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔[۲۰] یہی بات اِن مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف (اے محمدؐ) تم انہیں دعوت

---

[۲۰] یہاں اُسی بات کو پھر زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو پہلی آیت میں ارشاد ہوئی تھی۔ اِس میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی نئے مذہب کے بانی نہیں ہیں، نہ انبیاء میں سے کوئی اپنے کسی الگ مذہب کا بانی گزرا ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے ایک ہی دین ہے جسے شروع سے تمام انبیاء پیش کرتے چلے آ رہے ہیں، اور اسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کر رہے ہیں۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کا نام لیا گیا ہے جو طوفان کے بعد موجودہ نسلِ انسانی کے اوّلین پیغمبر تھے، اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے جو آخری نبی ہیں، پھر حضرت ابراہیمؑ کا نام لیا گیا ہے جنہیں اہلِ عرب اپنا پیشوا مانتے تھے۔ اور آخر میں حضرت موسٰیؑ اور حضرت عیسٰیؑ کا ذکر کیا گیا ہے جن کی طرف یہودی اور عیسائی اپنے مذہب کو منسوب کرتے ہیں۔ اِس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ انہی پانچ انبیاء کو اُس دین کی ہدایت کی گئی تھی۔ بلکہ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ دنیا میں جتنے انبیاء بھی آئے ہیں، سب ایک ہی دین لے کر آئے ہیں، اور نمونے کے طور پر اُن پانچ جلیل القدر انبیاء کا نام لے دیا گیا ہے جن سے دنیا کو معروف ترین آسمانی شریعتیں ملی ہیں۔ یہ آیت چونکہ دین اور اس کے مقصود پر بڑی اہم روشنی ڈالتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس پر پُوری طرح غور کر کے اسے سمجھا جائے:

فرمایا کہ "شَرَعَ لَکُمْ" "مقرر کیا تمہارے لیے"۔ شرع کے لغوی معنی راستہ بنانے کے ہیں، اور اصطلاحاً اِس سے مراد طریقہ اور ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا ہے۔ عربی زبان میں اِسی اصطلاحی معنی کے لحاظ سے تشریع کا لفظ قانون سازی (LEGISLATION) کا، شرع اور شریعت کا لفظ قانون (LAW) کا اور شارع کا لفظ واضعِ قانون (LAW-GIVER) کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ تشریع خداوندی دراصل فطری اور منطقی نتیجہ ہے اُن اصولی حقائق کا جو اوپر آیت نمبر ۹ اور ۱۰ میں بیان ہوتے ہیں کہ اللہ

ہی کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے، اور وہی انسان کا حقیقی ولی ہے، اور انسانوں کے درمیان جس امر میں بھی اختلاف ہو اُس کا فیصلہ کرنا اُسی کا کام ہے۔ اب چونکہ اصولاً اللہ ہی مالک اور ولی اور حاکم ہے، اس لیے لامحالہ وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ انسان کے لیے قانون و ضابطہ بنائے اور اسی کی یہ ذمہ داری ہے کہ انسانوں کو یہ قانون و ضابطہ دے۔ چنانچہ اپنی اس ذمہ داری کو اس نے یوں ادا کر دیا ہے۔

پھر فرمایا مِنَ الدِّیْنِ "از قسم دین"۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ "از آئین" کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تشریع فرمائی ہے اس کی نوعیت آئین کی ہے۔ لفظ "دین" کی جو تشریح ہم اس سے پہلے سورۂ زمر، حاشیہ نمبر ۳ میں کر چکے ہیں وہ اگر نگاہ میں رہے تو یہ سمجھنے میں کوئی الجھن پیش نہیں آسکتی کہ دین کے معنی ہی کسی کی سیادت و حاکمیت تسلیم کر کے اس کے احکام کی اطاعت کرنے کے ہیں۔ اور جب یہ لفظ طریقے کے معنی میں بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ طریقہ ہوتا ہے جسے آدمی واجب الاتباع اور جس کے مقرر کرنے والے کو مُطاع مانے۔ اِس بنا پر اللہ کے مقرر کیے ہوئے اِس طریقے کو دین کی نوعیت رکھنے والی تشریع کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی حیثیت محض سفارش (RECOMMENDATION) اور وعظ و نصیحت کی نہیں ہے، بلکہ یہ بندوں کے لیے اُن کے مالک کا واجب الاطاعت قانون ہے جس کی پیروی نہ کرنے کے معنی بغاوت کے ہیں اور جو شخص اس کی پیروی نہیں کرتا وہ دراصل اللہ کی سیادت و حاکمیت اور اپنی بندگی کا انکار کرتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع وہی ہے جس کی ہدایت نوح اور ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کو دی گئی تھی اور اُسی کی ہدایت اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔ اِس ارشاد سے کئی باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تشریع کو براہِ راست ہر انسان کے پاس نہیں بھیجا ہے بلکہ وقتاً فوقتاً جب اس نے مناسب سمجھا ہے ایک شخص کو اپنا رسول مقرر کر کے یہ تشریع اس کے حوالے کی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ تشریع ابتدا سے یکساں رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی زمانے میں کسی قوم کے لیے کوئی دین مقرر کیا گیا ہو اور کسی دوسرے زمانے میں کسی اور قوم کے لیے اُس سے مختلف اور متضاد دین بھیج دیا گیا ہو۔ خدا کی طرف سے بہت سے دین نہیں آئے ہیں، بلکہ جب بھی آیا ہے

بھی ایک دین آیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ کی سیادت و حاکمیت ماننے کے ساتھ اُن لوگوں کی رسالت کو ماننا جن کے ذریعہ سے یہ تشریع بھیجی گئی ہے۔ اور اُس وحی کو تسلیم کرنا جس میں یہ تشریع بیان کی گئی ہے، اس دین کا لازمی جُز ہے، اور عقل و منطق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو لازمی جُز ہونا چاہیے، کیونکہ آدمی اس تشریع کی اطاعت کر ہی نہیں سکتا جب تک وہ اُس کے خدا کی طرف سے مُستند (AUTHENTIC) ہونے پر مطمئن نہ ہو۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان سب انبیاء کو دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع اس ہدایت اور تاکید کے ساتھ دی گئی تھی کہ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ۔ اِس فقرے کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحب نے "قائم کنید دین را" کیا ہے، اور شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب نے "قائم رکھو دین کو"۔ یہ دونوں ترجمے درست ہیں۔ اقامت کے معنی قائم کرنے کے بھی ہیں اور قائم رکھنے کے بھی، اور انبیاء علیہم السلام ان دونوں ہی کاموں پر مامور تھے۔ ان کا پہلا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ دین قائم نہیں ہے وہاں اسے قائم کریں۔ اور دوسرا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ قائم ہو جائے یا پہلے سے قائم ہو وہاں اسے قائم رکھیں۔ ظاہر بات ہے کہ قائم رکھنے کی نوبت آتی ہی اس وقت ہے جب ایک چیز قائم ہو چکی ہو۔ ورنہ پہلے اسے قائم کرنا ہوگا، پھر یہ کوشش مسلسل جاری رکھنی پڑے گی کہ وہ قائم رہے۔

اب ہمارے سامنے دو سوالات آتے ہیں۔ ایک یہ کہ دین کو قائم کرنے سے مراد کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ خود دین سے کیا مراد ہے جسے قائم کرنے اور پھر قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے؟ ان دونوں باتوں کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

قائم کرنے کا لفظ جب کسی مادی یا جسمانی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد بیٹھے کو اٹھانا ہوتا ہے، مثلاً کسی انسان یا جانور کو اٹھانا یا پڑی ہوئی چیز کو کھڑا کرنا ہوتا ہے، جیسے بانس یا ستون کو قائم کرنا۔ یا کسی چیز کے بکھرے ہوئے اجزاء کو جمع کر کے اسے بلند کرنا ہوتا ہے، جیسے کسی خالی زمین میں عمارت قائم کرنا۔ لیکن جو چیزیں مادی نہیں بلکہ معنوی ہوتی ہیں اُن کے لیے جب قائم کرنے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اُس سے مراد اُس چیز کی تبلیغ کرنا نہیں بلکہ اس پر کما حقہٗ عملدر آمد کرنا، اُسے رواج دینا اور اُسے

عملاً نافذ کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنی حکومت قائم کی تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس نے اپنی حکومت کی طرف دعوت دی، بلکہ یہ ہوتے ہیں کہ اس نے ملک کے لوگوں کو اپنا مطیع کر لیا اور حکومت کے تمام شعبوں کی ایسی تنظیم کر دی کہ ملک کا سارا انتظام اس کے احکام کے مطابق چلنے لگا۔ اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ ملک میں عدالتیں قائم ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انصاف کرنے کے لیے منصف مقرر ہیں اور وہ مقدمات کی سماعت کر رہے ہیں اور فیصلے دے رہے ہیں، نہ یہ کہ عدل و انصاف کی خوبیاں خوب خوب بیان کی جا رہی ہیں اور لوگ ان کے قائل ہو رہے ہیں۔ اسی طرح جب قرآن مجید میں حکم دیا جاتا ہے کہ نماز قائم کرو تو اس سے مراد نماز کی دعوت و تبلیغ نہیں ہوتی بلکہ یہ ہوتی ہے کہ نماز کو اُس کی تمام شرائط کے ساتھ نہ صرف خود ادا کرو بلکہ ایسا انتظام کرو کہ وہ اہلِ ایمان میں باقاعدگی کے ساتھ رائج ہو جائے۔ مسجدیں ہوں۔ جمعہ و جماعت کا اہتمام ہو۔ وقت کی پابندی کے ساتھ اذانیں دی جائیں۔ امام اور خطیب مقرر ہوں۔ اور لوگوں کو وقت پر مسجدوں میں آنے اور نماز ادا کرنے کی عادت پڑ جائے۔ اس تشریح کے بعد یہ بات سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آسکتی کہ انبیاء علیہم السلام کو جب اس دین کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تو اس سے مراد صرف اتنی بات نہ تھی کہ وہ خود اس دین پر عمل کریں، اور اتنی بات بھی نہ تھی کہ وہ دوسروں میں اس کی تبلیغ کریں تاکہ لوگ اس کا برحق ہونا تسلیم کر لیں، بلکہ یہ بھی تھی کہ جب لوگ اسے تسلیم کر لیں تو اس سے آگے قدم بڑھا کر پورا کا پورا دین اُن میں عملاً رائج اور نافذ کیا جائے تاکہ اس کے مطابق عملدرآمد ہونے لگے اور ہوتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ دعوت و تبلیغ اِس کام کا لازمی ابتدائی مرحلہ ہے جس کے بغیر دوسرا مرحلہ پیش نہیں آسکتا۔ لیکن ہر صاحبِ عقل آدمی خود دیکھ سکتا ہے کہ اِس حکم میں دعوت و تبلیغ کو مقصود کی حیثیت نہیں دی گئی ہے، بلکہ دین قائم کرنے اور قائم رکھنے کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔ دعوت و تبلیغ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ضرور ہے، مگر بجائے خود مقصد نہیں ہے، کجا کہ کوئی شخص اسے انبیاء کے مشن کا مقصدِ وحید قرار دے بیٹھے۔

اب دوسرے سوال کو لیجیے۔ بعض لوگوں نے دیکھا کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے

وہ تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان مشترک ہے، اور شریعتیں ان سب کی مختلف رہی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا، اس لیے انہوں نے یہ رائے قائم کرلی کہ لامحالہ اس دین سے مراد شرعی احکام و ضوابط نہیں ہیں بلکہ صرف توحید و آخرت اور کتاب و نبوت کا ماننا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بجا لانا ہے، یا حد سے حد اس میں وہ موٹے موٹے اخلاقی اصول شامل ہیں جو سب شریعتوں میں مشترک رہے ہیں۔ لیکن یہ ایک بڑی سطحی رائے ہے جو محض سرسری نگاہ سے دین کی وحدت اور شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر قائم کرلی گئی ہے، اور یہ ایسی خطرناک رائے ہے کہ اگر اس کی اصلاح نہ کردی جائے تو آگے بڑھ کر بات دین و شریعت کی اُس تفریق تک جا پہنچے گی جس میں مبتلا ہو کر سینٹ پال نے دین بلا شریعت کا نظریہ پیش کیا اور سیدنا مسیح علیہ السلام کی امت کو خراب کردیا۔ اس لیے کہ جب شریعت دین سے الگ ایک چیز ہے، اور حکم صرف دین کو قائم کرنے کا ہے نہ کہ شریعت کو، تو لامحالہ مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح شریعت کو غیر اہم اور اس کی اقامت کو غیر مقصود بالذات سمجھ کر نظر انداز کردیں گے اور صرف ایمانیات اور موٹے موٹے اخلاقی اصولوں کو لے کر بیٹھ جائیں گے۔ اِس طرح کے قیاسات سے دین کا مفہوم متعین کرنے کے بجائے آخر کیوں نہ ہم خود اللہ کی کتاب سے پوچھ لیں کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم یہاں دیا گیا ہے، آیا اس سے مراد صرف ایمانیات اور چند بڑے بڑے اخلاقی اصول ہی ہیں، یا شرعی احکام بھی۔ قرآن مجید کا جب ہم تتبع کرتے ہیں تو اس میں جن چیزوں کو دین میں شمار کیا گیا ہے ان میں حسب ذیل چیزیں بھی ہمیں ملتی ہیں:

(۱) وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ (البیّنہ، آیت ۵) "اور ان کو حکم نہیں دیا گیا مگر اس بات کا کہ یکسو ہو کر اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اور یہی راست رو ملت کا دین ہے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ اِس دین میں شامل ہیں، حالانکہ ان دونوں کے احکام مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمام پچھلی شریعتوں میں نماز کی یہی شکل و ہیئت، یہی اس کے اجزاء، یہی اس کی رکعتیں، یہی اس کا

قبلہ بھی اُس کے اوقات، اور یہی اس کے دوسرے احکام رہتے ہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق بھی کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ تمام شریعتوں میں یہی اس کا نصاب، یہی اس کی شرحیں، اور یہی اس کی تحصیل اور تقسیم کے احکام رہے ہیں لیکن اختلافِ شرائع کے باوجود اللہ تعالیٰ اِن دونوں چیزوں کو دین میں شمار کر رہا ہے۔

(۲) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ... اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ ... (المائدہ ۳) "تمہارے لیے حرام کیا گیا مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ اور وہ جو گلا گھٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اُس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا۔ اور جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔ نیز یہ بھی تمہارے لیے حرام کیا گیا کہ تم پانسوں کے ذریعہ سے اپنی قسمت معلوم کرو۔ یہ سب کام فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ..." اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب احکامِ شریعت بھی دین ہی ہیں۔

(۳) قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ (التوبہ۔ ۲۹) "جنگ کرو اُن لوگوں سے جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔" معلوم ہوا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ حلال و حرام کے اُن احکام کو ماننا اور ان کی پابندی کرنا بھی دین ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے دیئے ہیں۔

(۴) اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النور۔ ۲) "زانیہ عورت اور مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملہ میں تم کو دامنگیر نہ ہو اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔" مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ (یوسف ۷۶) "یوسفؑ اپنے بھائی کو بادشاہ کے دین میں پکڑ لینے کا مجاز نہ تھا۔" اِس سے معلوم ہوا کہ فوجداری قانون

بھی دین ہے۔ اگر آدمی خدا کے فوجداری قانون پر چلے تو وہ خدا کے دین کا پیرو ہے اور اگر بادشاہ کے قانون پر چلے تو وہ بادشاہ کے دین کا پیرو۔

یہ چار تو وہ نمونے ہیں جن میں شریعت کے احکام کو بالفاظِ صریح دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ نے جہنم کی دھمکی دی ہے (مثلاً زنا، سود خواری، قتلِ مومن، یتیم کا مال کھانا، باطل طریقوں سے لوگوں کے مال لینا، وغیرہ)، اور جن جرائم کو خدا کے عذاب کا موجب قرار دیا ہے (مثلاً عملِ قومِ لوط، اور لین دین میں قومِ شعیب کا رویہ) ان کا سدِباب لازماً دین ہی میں شمار ہونا چاہیے، اس لیے کہ دین اگر جہنم اور عذابِ الٰہی سے بچانے کے لیے نہیں آیا ہے تو اور کس چیز کے لیے آیا ہے؟ اسی طرح وہ احکامِ شریعت بھی دین ہی کا حصہ ہونے چاہییں جن کی خلاف ورزی کو خلود فی النار کا موجب قرار دیا گیا ہے، مثلاً میراث کے احکام، جن کو بیان کرنے کے بعد آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (النساء-۱۴) "جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی اور اللہ کے حدود سے تجاوز کرے گا، اللہ اس کو دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔" اسی طرح جن چیزوں کی حرمت اللہ تعالیٰ نے پوری شدت اور قطعیت کے ساتھ بیان کی ہے، مثلاً ماں بہن اور بیٹی کی حرمت، شراب کی حرمت، چوری کی حرمت، جوئے کی حرمت، جھوٹی شہادت کی حرمت، ان کی تحریم کو اگر اقامتِ دین میں شامل نہ کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ غیر ضروری احکام بھی دے دیئے ہیں جن کا اجراء مقصود نہیں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جن کاموں کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، مثلاً روزہ اور حج، ان کی اقامت کو بھی محض اس بہانے اقامتِ دین سے خارج نہیں کیا جاسکتا کہ رمضان کے ۳۰ روزے تو پچھلی شریعتوں میں نہ تھے، اور کعبے کا حج تو صرف اُس شریعت میں تھا جو اولادِ ابراہیمؑ کی اسماعیلی شاخ کو ملی تھی۔

دراصل ساری غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ آیت لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (ہم نے تم میں سے ہر امت کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ مقرر کر دی) کا الٹا مطلب لے کر اسے یہ معنی پہنا دیئے گئے ہیں کہ شریعت چونکہ ہر امت کے لیے الگ تھی، اور حکم صرف اُس دین

کے قائم کرنے کا دیا گیا ہے جو تمام انبیاء کے درمیان مشترک تھا، اس لیے اقامتِ دین کے حکم میں اقامتِ شریعت شامل نہیں ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس آیت کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ سورۂ مائدہ میں جس مقام پر یہ آیت آئی ہے اُس کے پورے سیاق و سباق کو آیت ۴۱ سے آیت ۵۰ تک اگر کوئی شخص بغور پڑھے تو معلوم ہو گا کہ اس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس نبی کی امت کو جو شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے دی تھی وہ اُس اُمت کے لیے دین تھی اور اُس کے دورِ نبوت میں اُسی کی اقامت مطلوب تھی۔ اور اب چونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ نبوت ہے، اس لیے امتِ محمدیہ کو جو شریعت دی گئی ہے وہ اِس دور کے لیے دین ہے اور اُس کا قائم کرنا ہی دین کا قائم کرنا ہے۔ رہا ان شریعتوں کا اختلاف، تو اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعتیں باہم متضاد تھیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جزئیات میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق رہا ہے۔ مثال کے طور پر نماز اور روزے کو دیکھیے۔ نماز تمام شریعتوں میں فرض رہی ہے، مگر قبلہ ساری شریعتوں کا ایک نہ تھا، اور اس کے اوقات اور رکعات اور اجزاء میں بھی فرق تھا۔ اِسی طرح روزہ ہر شریعت میں فرض تھا مگر رمضان کے ۳۰ روزے دوسری شریعتوں میں نہ تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ مطلقاً نماز اور روزہ تو اقامتِ دین میں شامل ہے، مگر ایک خاص طریقے سے نماز پڑھنا اور خاص زمانے میں روزہ رکھنا اقامتِ دین سے خارج ہے۔ بلکہ اس سے صحیح طور پر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نبی کی امت کے لیے اُس وقت کی شریعت میں نماز اور روزے کے لیے جو قاعدے مقرر کیے گئے تھے اُنہی کے مطابق اُس زمانے میں نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا دین قائم کرنا تھا، اور اب اقامتِ دین یہ ہے کہ ان عبادتوں کے لیے شریعتِ محمدیہ میں جو طریقہ رکھا گیا ہے ان کے مطابق انہیں ادا کیا جائے۔ انہی دو مثالوں پر دوسرے تمام احکامِ شریعت کو بھی قیاس کر لیجیے۔

قرآنِ مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے، بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دینِ حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی اور قانونی و سیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لیے جان لڑا دیں، اور

ان کو انسانی زندگی کی اصلاح کا وہ پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصّے پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ یہ کتاب اپنے نازل کیے جانے کا مقصد یہ بیان کرتی ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء۔ ۱۰۵)۔ "اے نبی، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اُس روشنی میں جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے"۔ اس کتاب میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے جو احکام دیئے گئے ہیں وہ صریحاً اپنے پیچھے ایک ایسی حکومت کا تصوّر رکھتے ہیں جو ایک مقرر قاعدے کے مطابق زکوٰۃ وصول کر کے مستحقین تک پہنچانے کا ذمہ لے (التوبہ۔ ۶۰۔ ۱۰۳)۔ اِس کتاب میں سود کو بند کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اور سُود خواری جاری رکھنے والوں کے خلاف جو اعلانِ جنگ کیا گیا ہے (البقرہ ۲۷۵۔ ۲۷۹) وہ اسی صورت میں روبعمل آ سکتا ہے جب ملک کا سیاسی اور معاشی نظام پُوری طرح اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ اِس کتاب میں قاتل سے قصاص لینے کا حکم (البقرہ۔ ۱۷۸) چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم (المائدہ۔ ۳۸) زنا اور قذف پر حد جاری کرنے کا حکم (النور۔ ۲۔ ۴) اِس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ ان احکام کے مخاطب اہلِ ایمان کفّار کی پولیس اور عدالتوں کے ماتحت رہیں گے۔ اِس کتاب میں کفّار سے قتال کا حکم (البقرہ۔ ۱۹۰۔ ۲۱۶) یہ سمجھتے ہوئے نہیں دیا گیا ہے کہ اس دین کے پیرو کفر کی حکومت میں فوج بھرتی کریں گے۔ اِس کتاب میں اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا حکم (التوبہ۔ ۲۹) اِس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ مسلمان کافروں کی رعایا ہوتے ہوئے اُن سے جزیہ وصول کریں گے اور اُن کی حفاظت کا ذمّہ لیں گے۔ اور یہ معاملہ صرف مدنی سورتوں ہی تک محدود نہیں ہے۔ مکّی سورتوں میں بھی دیدۂ بینا کو علانیہ یہ نظر آ سکتا ہے کہ ابتدا ہی سے جو نقشہ پیشِ نظر تھا وہ دین کے غلبہ و اقتدار کا تھا نہ کہ کفر کی حکومت کے تحت دین اور اہلِ دین کے ذمّی بن کر رہنے کا۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم ص ۶۲۳۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۳۸، جلد سوم ص ۶۶۵ تا ۶۶۷۔ ۳۰۰۔ ۷ تا ۷۳۲۔ جلد چہارم، الصافات، آیات ۱۷۱ تا ۱۷۹ (حواشی ۹۳۔ ۹۴)۔ صٓ، دیباچہ اور آیت ۱۱ مع حاشیہ ۱۲۔

سب سے بڑھ کر جس چیز سے تعبیر کی یہ غلطی متصادم ہوتی ہے وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

وہ عظیم الشان کام ہے جو حضورؐ نے ۲۳ سال کے زمانۂ رسالت میں انجام دیا۔ آخر کون نہیں جانتا کہ آپ نے تبلیغ اور تلوار دونوں سے پورے عرب کو مسخر کیا اور اُس میں ایک مکمل حکومت کا نظام ایک مفصل شریعت کے ساتھ قائم کر دیا جو اعتقادات اور عبادات سے لے کر شخصی کردار، اجتماعی اخلاق، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، سیاست و عدالت اور صلح و جنگ تک زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی تھی۔ اگر حضورؐ کے اس پورے کام کو "اقامتِ دین" کے اُس حکم کی تفسیر نہ مانا جائے جو اس آیت کے مطابق تمام انبیاءؑ سمیت آپ کو دیا گیا تھا، تو پھر اس کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ یا تو معاذ اللہ حضورؐ پر یہ الزام عائد کیا جائے کہ آپ مامور تو صرف ایمانیات اور اخلاق کے موٹے موٹے اصولوں کی محض تبلیغ و دعوت پر ہوتے تھے، مگر آپ نے اس سے تجاوز کر کے بطورِ خود ایک حکومت قائم کر دی اور ایک مفصل قانون بنا ڈالا جو شرائع انبیاء کی قدرِ مشترک سے مختلف بھی تھا اور زائد بھی۔ یا پھر اللہ تعالیٰ پر یہ الزام رکھا جائے کہ وہ سورۂ شوریٰ میں مذکورۂ بالا اعلان کر چکنے کے بعد خود اپنی بات سے منحرف ہو گیا اور اس نے اپنے آخری نبیؐ سے نہ صرف وہ کام لیا جو اس سورۃ کی اعلان کردہ "اقامتِ دین" سے بہت کچھ زائد اور مختلف تھا، بلکہ اس کام کی تکمیل پر اپنے پہلے اعلان کے خلاف یہ دوسرا اعلان بھی کر دیا کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کیا)، اعاذنا اللہ من ذالک۔ اِن دو صورتوں کے سوا اگر کوئی تیسری صورت ایسی نکلتی ہو جس سے "اقامتِ دین" کی یہ تعبیر بھی قائم رہے اور اللہ یا اس کے رسول پر کوئی الزام بھی عائد نہ ہوتا ہو تو ہم ضرور اُسے معلوم کرنا چاہیں گے۔

اقامتِ دین کا حکم دینے کے بعد، آخری بات جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ "دین میں تفرقہ نہ برپا کرو"، یا "اس کے اندر متفرق نہ ہو جاؤ"۔ دین میں تفرقہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی دین کے اندر اپنی طرف سے کوئی نرالی بات ایسی نکالے جس کی کوئی معقول گنجائش اُس میں نہ ہو اور اصرار کرے کہ اس کی نکالی ہوئی بات کے ماننے ہی پر کفر و ایمان کا مدار ہے، پھر جو ماننے والے ہوں انہیں لے کر نہ ماننے والوں سے جُدا ہو جائے۔ یہ نرالی بات کئی طرح کی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین میں جو چیز نہ تھی وہ اس میں لا کر شامل کر دی جائے۔ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین میں

رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے، اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اُسی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف رجوع کرے۔[۲۲]

جو بات شامل تھی اسے نکال باہر کیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین کی نصوص میں تحریف کی حد تک پہنچی ہوئی تاویلات کر کے نرالے عقائد اور انوکھے اعمال ایجاد کیے جائیں۔ اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین کی باتوں میں ردو بدل کر کے اس کا حلیہ بگاڑا جائے، مثلاً جو چیز اہم تھی اسے غیر اہم بنا دیا جائے اور جو چیز حد سے حد مباح کے درجے میں تھی اسے فرض و واجب بلکہ اس سے بھی بڑھا کر اسلام کا رکن رکین بنا ڈالا جائے۔ اسی طرح کی حرکتوں سے انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں پہلے تفرقہ برپا ہوا، پھر رفتہ رفتہ ان فرقوں کے مذاہب بالکل الگ مستقل ادیان بن گئے جن کے ماننے والوں میں اب یہ تصور تک باقی نہیں رہا ہے کہ کبھی ان سب کی اصل ایک تھی۔ اِس تفرقے کا اُس جائز اور معقول اختلافِ رائے سے کوئی تعلق نہیں ہے جو دین کے احکام کو سمجھنے اور نصوص پر غور کر کے اُن سے مسائل مستنبط کرنے میں فطری طور پر اہلِ علم کے درمیان واقع ہوتا ہے اور جس کے لیے خود کتاب اللہ کے الفاظ میں لغت اور محاورے اور قواعدِ زبان کے لحاظ سے گنجائش ہوتی ہے۔ (اس موضوع پر مزید تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۱۶۲-۱۶۳-۲۳۹-۲۴۰-۲۵۴-۴۲۷ تا ۴۲۹-۴۹۱ تا ۴۹۵-۶۰۴۔ جلد دوم، ص ۵۷۵ تا ۵۸۱۔ جلد سوم، ص ۱۸۴ تا ۱۸۶-۲۴۹-۲۸۱ تا ۲۸۳-۶۴۵ تا ۶۴۹-۷۵۴ تا ۷۵۶)۔

[۲۲] یہاں پھر وہی بات دُہرائی گئی ہے جو اِس سے پہلے آیت ۸-۹ میں ارشاد ہو چکی ہے اور جس کی تشریح ہم حاشیہ نمبر ۱۱ میں کر چکے ہیں۔ اس جگہ یہ بات ارشاد فرمانے کا مدعا یہ ہے کہ تم اِن لوگوں کے سامنے دین کی صاف شاہراہ پیش کر رہے ہو اور یہ نادان اس نعمت کی قدر کرنے کے بجائے الٹے اس پر بگڑ رہے ہیں۔ مگر انہی کے درمیان انہی کی قوم میں وہ لوگ موجود ہیں جو اللہ کی طرف رجوع کر رہے ہیں اور اللہ بھی انہیں کھینچ کھینچ کر اپنی طرف لا رہا ہے۔ اب یہ اپنی اپنی قسمت ہے کہ کوئی اِس نعمت کو پائے اور کوئی اس پر عار کھائے۔ مگر اللہ کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے۔ وہ اُسی کو اپنی طرف کھینچتا ہے جو اس کی طرف بڑھے۔ دُور بھاگنے والوں کے پیچھے دوڑنا اللہ کا کام نہیں ہے۔

لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ اِس کے بعد ہوا کہ اُن کے پاس علم آچکا تھا[۲۲]، اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے[۲۳]۔ اگر تیرا رب پہلے ہی یہ نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقتِ مقرر تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا[۲۴]۔ اور

۲۲ ؎ یعنی تفرقے کا سبب یہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء نہیں بھیجے تھے اور کتابیں نازل نہیں کی تھیں اس وجہ سے لوگ راہِ راست نہ جاننے کے باعث اپنے اپنے الگ مذاہب اور مدارسِ فکر اور نظامِ زندگی خود ایجاد کر بیٹھے، بلکہ یہ تفرقہ اُن میں اللہ کی طرف سے علم آجانے کے بعد رونما ہوا۔ اس لیے اللہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے بلکہ وہ لوگ خود اُس کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے دین کے صاف صاف اصول اور شریعت کے واضح احکام سے ہٹ کر نئے نئے مذاہب و مسالک بنائے۔

۲۳ ؎ یعنی اِس تفرقہ پردازی کا محرک کوئی نیک جذبہ نہیں تھا، بلکہ یہ اپنی نرالی اُپج دکھانے کی خواہش، اپنا الگ جھنڈا بلند کرنے کی فکر، آپس کی ضدّم ضدّا، ایک دوسرے کو زک دینے کی کوشش اور مال و جاہ کی طلب کا نتیجہ تھی۔ ہوشیار اور حوصلہ مند لوگوں نے دیکھا کہ بندگانِ خدا اگر سیدھے سیدھے خدا کے دین پر چلتے رہیں تو بس ایک خدا ہوگا جس کے آگے لوگ جھکیں گے، ایک رسول ہوگا جس کو لوگ پیشوا اور رہنما مانیں گے، ایک کتاب ہوگی جس کی طرف لوگ رجوع کریں گے، اور ایک صاف عقیدہ اور بے لاگ ضابطہ ہوگا جس کی پیروی وہ کرتے رہیں گے۔ اس نظام میں اُن کی اپنی ذات کے لیے کوئی مقامِ امتیاز نہیں ہو سکتا جس کی وجہ سے ان کی مشیخت چلے، اور لوگ اُن کے گرد جمع ہوں اور ان کے آگے سر بھی جھکائیں اور جیبیں بھی خالی کریں۔ یہی وہ اصل سبب تھا جو نئے نئے عقائد اور فلسفے، نئے نئے طرزِ عبادت اور مذہبی مراسم اور نئے نئے نظامِ حیات ایجاد کرنے کا محرک بنا اور اسی نے خلقِ خدا کے ایک بڑے حصّے کو دین کی صاف شاہ راہ سے ہٹا کر مختلف راہوں میں پراگندہ کر دیا۔ پھر یہ پراگندگی اِن گروہوں کی باہمی بحث و جدال اور مذہبی و معاشی اور سیاسی کشمکش کی بدولت شدید تلخیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ نوبت اُن خونریزیوں تک پہنچی جن کے چھینٹوں سے تاریخِ انسانی سُرخ ہو رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اُس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔[۲۵]

۲۴؎ یعنی دنیا ہی میں عذاب دے کر ان سب لوگوں کا خاتمہ کر دیا جاتا جو گمراہیاں نکالنے اور ان کی پیروی کرنے کے مجرم تھے، اور صرف راہ راست پر چلنے والے باقی رکھے جاتے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی کہ خدا کے نزدیک حق پر کون ہیں اور باطل پر کون۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ دو ٹوک فیصلہ قیامت تک کے لیے ملتوی کر رکھا ہے۔ کیونکہ دنیا میں یہ فیصلہ کر دینے کے بعد نوعِ انسان کی آزمائش بے معنی ہو جاتی ہے۔

۲۵؎ مطلب یہ ہے کہ ہر نبی اور اس کے فریق تابعین کا دور گزر جانے کے بعد جب پچھلی نسلوں تک کتاب اللہ پہنچی تو انہوں نے اسے یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں لیا بلکہ وہ اس کے متعلق سخت شکوک اور ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہو گئیں۔ اس حالت میں ان کے مبتلا ہو جانے کے بہت سے وجوہ تھے جنہیں ہم اُس صورتِ حال کا مطالعہ کر کے باسانی سمجھ سکتے ہیں جو توراۃ و انجیل کے معاملہ میں پیش آئی ہے۔ ان دونوں کتابوں کو اگلی نسلوں نے اُن کی اصلی حالت پر اُن کی اصل عبارت اور زبان میں محفوظ رکھ کر پچھلی نسلوں تک نہیں پہنچایا۔ اُن میں خدا کے کلام کے ساتھ تفسیر و تاریخ اور سماعی روایات اور فقہا کے نکالے ہوئے جزئیات کی صورت میں انسانی کلام گڈمڈ کر دیا۔ ان کے ترجموں کو اتنا رواج دیا کہ اصل غائب ہو گئی اور صرف ترجمے باقی رہ گئے۔ ان کی تاریخی سند بھی اس طرح ضائع کر دی کہ اب کوئی شخص بھی پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ جو کتاب اس کے ہاتھ میں ہے وہ وہی ہے جو حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ کے ذریعہ سے دنیا والوں کو ملی تھی۔ پھر اُن کے اکابر نے وقتاً فوقتاً مذہب، الٰہیات، فلسفہ، قانون، طبیعیات، نفسیات اور اجتماعیات کی ایسی بحثیں چھیڑیں اور ایسے نظامِ فکر بنا ڈالے جن کی بھول بھلیاں میں پھنس کر لوگوں کے لیے یہ طے کرنا محال ہو گیا کہ ان پیچیدہ راستوں کے درمیان حق کی سیدھی شاہراہ کون سی ہے۔ اور چونکہ کتاب اللہ اپنی اصل حالت اور قابلِ اعتماد صورت میں موجود نہ تھی، اس لیے لوگ کسی ایسی سند کی طرف رجوع بھی نہ کر سکتے تھے جو حق کو باطل سے ممیز کرنے میں ان کی مدد کرتی۔

چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے اس لیے اے محمدؐ، اب تم اُسی دین کی طرف دعوت دو، اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اُس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ، اور اِن لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو[۲۶]، اور اِن سے کہہ دو کہ: "اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اُس پر ایمان لایا[۲۷]۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں[۲۸]۔ اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال

۲۶؎ یعنی اِن کو راضی کرنے کے لیے اِس دین کے اندر کوئی ردّ و بدل اور کمی بیشی نہ کرو۔ "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول پر اِن گمراہ لوگوں سے کوئی مصالحت نہ کرو۔ اِن کے اوہام اور تعصبات اور جاہلانہ طور طریقوں کے لیے دین میں کوئی گنجائش محض اس لالچ میں آ کر نہ نکالو کہ کسی نہ کسی طرح یہ دائرۂ اسلام میں آ جائیں۔ جس کو ماننا ہے، خدا کے اصلی اور خالص دین کو، جیسا کہ اس نے بھیجا ہے، سیدھی طرح مان لے، ورنہ جس جہنّم میں جا کر گرنا چاہے گر جائے۔ خدا کا دین لوگوں کی خاطر نہیں بدلا جا سکتا۔ لوگ اگر اپنی فلاح چاہتے ہیں تو خود اپنے آپ کو بدل کر اس کے مطابق بنائیں۔

۲۷؎ بالفاظِ دیگر، مَیں اُن تفرقہ پرداز لوگوں کی طرح نہیں ہوں جو خدا کی بھیجی ہوئی بعض کتابوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ مَیں ہر اُس کتاب کو مانتا ہوں جسے خدا نے بھیجا ہے۔

۲۸؎ اِس جامع فقرے کے کئی مطلب ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ مَیں اِن ساری گروہ بندیوں سے الگ رہ کر بے لاگ انصاف پسندی اختیار کرنے پر مامور ہوں۔ میرا کام یہ نہیں ہے کہ کسی گروہ کے حق میں اور کسی کے خلاف تعصّب برتوں۔ میرا سب انسانوں سے یکساں تعلق ہے، اور وہ ہے سراسر عدل و انصاف کا تعلق۔ جس کی جو بات حق ہے، مَیں اس کا ساتھی ہوں، خواہ وہ غیروں کا غیر ہی کیوں نہ ہو۔ اور جس کی جو بات حق کے خلاف ہے میں اس کا مخالف ہوں، خواہ وہ میرا قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ مَیں جس حق کو تمہارے سامنے پیش کرنے پر مامور ہوں اس میں کسی کے لیے بھی کوئی امتیاز نہیں ہے، بلکہ وہ سب کے لیے یکساں ہے۔ اس میں اپنے اور غیر، بڑے اور چھوٹے، غریب اور امیر، شریف اور کمین کے لیے الگ الگ حقوق نہیں ہیں۔ بلکہ جو کچھ ہے وہ سب کے لیے حق ہے، جو گناہ ہے وہ سب کے لیے گناہ ہے، جو حرام ہے وہ سب کے لیے حرام ہے، اور جو جُرم ہے وہ سب کے لیے جُرم ہے۔ اِس بے لاگ ضابطے میں میری اپنی ذات کے لیے بھی کوئی استثناء نہیں۔ تیسرا مطلب یہ ہے

ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے[۲۹]۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں[۳۰]۔ اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کریگا اور اُسی کی طرف سب کو جانا ہے"۔

اللہ کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد جو لوگ (لبیک کہنے والوں سے) اللہ کے دین کے معاملہ میں جھگڑے کرتے ہیں[۳۱]، اُن کی حجت بازی اُن کے رب کے نزدیک باطل ہے، اور اُن پر اس کا غضب ہے، اور اُن کے لیے سخت عذاب ہے۔

کہ میں دنیا میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں۔ میرے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے درمیان انصاف کروں، اور اُن بے اعتدالیوں اور بے انصافیوں کا خاتمہ کردوں جو تمہاری زندگیوں میں اور تمہارے معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔ اِن تین مطالب کے علاوہ اس فقرے کا ایک چوتھا مطلب بھی ہے جو مکۂ معظمہ میں نہ کھلا تھا مگر ہجرت کے بعد کھل گیا، اور وہ یہ ہے کہ میں خدا کا مقرر کیا ہوا قاضی اور جج ہوں، تمہارے درمیان انصاف کرنا میری ذمہ داری ہے۔

[۲۹] یعنی ہم میں سے ہر ایک اپنے عمل کا خود ذمہ دار و جوابدہ ہے۔ تم اگر نیکی کروگے تو اس کا پھل ہمیں نہیں پہنچ جائے گا، بلکہ تم ہی اس سے متمتع ہوگے۔ اور ہم اگر بُرائی کریں گے تو اس کی پاداش میں تم نہیں پکڑے جاؤ گے، بلکہ ہمیں خود ہی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یہی بات سورۂ بقرہ، آیت ۱۳۹، سورۂ یونس، آیت ۴۱، سورۂ ہود، آیت ۳۵، اور سورۂ قصص، آیت ۵۵ میں اس سے پہلے ارشاد ہو چکی ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن۔ جلد اول، ص ۱۱۷، جلد دوم، ص ۲۰۷-۳۳۷۔ جلد سوم، ص ۶۴۶ -- ۶۵)۔

[۳۰] یعنی معقول دلائل سے بات سمجھانے کا جو حق تھا وہ ہم نے ادا کر دیا۔ اب خواہ مخواہ کی تُو تُو مَیں مَیں کرنے سے کیا حاصل۔ تم اگر جھگڑا کرو بھی تو ہم تم سے جھگڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

[۳۱] یہ اشارہ ہے اُس صورتِ حال کی طرف جو مکّے میں اُس وقت آئے دن پیش آرہی تھی۔ جہاں کسی کے متعلق لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑ جاتے، مدتوں اس کی جان ضیق میں کیے رکھتے، نہ گھر میں اسے چین لینے دیا جاتا نہ محلے اور برادری میں، جہاں بھی وہ جاتا

وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب اور میزان نازل کی ہے[۳۲]۔ اور تمہیں کیا خبر، شاید کہ فیصلے کی گھڑی قریب ہی آلگی ہو[۳۳]۔ جو لوگ اس کے آنے پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں، مگر جو اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یقیناً وہ آنے والی ہے۔ خوب سُن لو، جو لوگ اُس گھڑی کے آنے میں شک ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں وہ گمراہی میں بہت دُور نکل گئے ہیں۔

ایک نہ ختم ہونے والی بحث چھڑ جاتی جس کا مدعا یہ ہوتا کہ کسی طرح وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر اُسی جاہلیت میں پلٹ آتے جس سے وہ نکلا ہے۔

۳۲۔ میزان سے مراد اللہ کی شریعت ہے جو ترازو کی طرح تول کر صحیح اور غلط، حق اور باطل، ظلم اور عدل، راستی اور ناراستی کا فرق واضح کر دیتی ہے۔ اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلوایا گیا تھا کہ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں)۔ یہاں بتا دیا گیا کہ اِس کتابِ پاک کے ساتھ وہ میزان آگئی ہے جس کے ذریعہ سے یہ انصاف قائم کیا جائے گا۔

۳۳۔ یعنی جس کو بھی سیدھا ہونا ہے بلا تاخیر سیدھا ہو جائے۔ فیصلے کی گھڑی کو دُور سمجھ کر ٹالنا نہیں چاہیے۔ ایک سانس کے متعلق بھی آدمی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کے بعد دوسرے سانس کی اسے مہلت ضرور ہی مل جائے گی۔ ہر سانس آخری سانس ہو سکتا ہے۔

قرآن کی معاشی تعلیمات

(ابو الاعلیٰ مودودی)

(۲)

۸۔ بخل اور اکتناز کی ممانعت دولت حاصل کرنے کے غلط طریقوں کو حرام کرنے کے ساتھ قرآن مجید جائز طریقوں سے حاصل شدہ دولت کو بھی جمع کر کے روک رکھنے کی سخت مذمت کرتا ہے، اور ہمیں بتاتا ہے کہ بخل ایک بہت بڑی برائی ہے:

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗٓ اَخْلَدَہٗ کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَۃِ (۱۰۴: ۱-۴)	بڑی خرابی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو عیب چین اور بدگو ہے، جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس ہمیشہ رہے گا۔ ہرگز نہیں، وہ پھینکا جائے گا توڑ ڈالنے والی آگ میں۔
وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۹: ۳۵)	اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک سزا کی خبر دے دو۔
وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۶۴: ۱۶)	اور جو دل کی تنگی (یا نفس کی بخیلی) سے محفوظ رہے، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔
وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ھُوَ خَیْرًا لَّھُمْ	اور جو لوگ اللہ کے دیئے ہوئے فضل کے معاملہ میں بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس غلط فہمی

بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ، سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۳ : ۱۸۰)

میں نہ رہیں کہ یہ ان کے لیے اچھا ہے۔ بلکہ یہ ان کے لیے بہت برا ہے جس مال میں انہوں نے بخل کیا ہے اسی کا طوق قیامت کے روز ان کے گلے میں ڈالا جائے گا۔[ا]

۹ - زر پرستی اور حرص مال کی مذمت اس کے ساتھ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ زر پرستی، دولتِ دنیا کی حرص و ہوس، اور خوش حالی پر فخر و غرور انسان کی گمراہی اور بالآخر اس کی تباہی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ہے:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ (۱۰۲ : ۱-۳)

تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی فکر نے مستغرق کر رکھا ہے، قبر میں جانے تک تم اسی فکر میں منہمک رہتے ہو، یہ ہرگز تمہارے لیے نافع نہیں ہے جلدی ہی تم کو اس کا انجام معلوم ہو جائے گا۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (۲۸ : ۵۸)

کتنی ہی بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جو اپنی معیشت پر اترائیں، اب دیکھ لو اُن کے گھروں کو، کم ہی کوئی ان کے بعد ان گھروں میں بسا ہے، اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (۳۴ : ۳۴، ۳۵)

ہم نے جس بستی میں بھی کوئی متنبہ کرنے والا بھیجا اُس کے دولت مند لوگوں نے اُس سے کہا کہ جو پیغام رسالت تم لے کر آئے ہو ہم اس کے منکر ہیں۔ اور انہوں نے کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز عذاب پانے والے نہیں ہیں۔

۱۰ - بے جا خرچ کی مذمت دوسری طرف قرآن مجید اس بات کی بھی سخت مذمت کرتا ہے کہ انسان جائز

[ا] اس مضمون کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو قرآن ۴۷ : ۳۸ - ۵۷ : ۲۴ - ۲۹ : ۳۴ - ۷۰ : ۲۱ - ۲۴ - ۷۴ : ۴۵ - ۸۹ : ۱۵ تا ۲۰ - ۹۲ : ۱۱ - ۱۰۷ : ۱ - ۲، ۳، ۷۔

طریقوں سے حاصل شدہ دولت کو ناجائز کاموں میں اڑائے، یا اپنے ہی عیش اور لطف و لذت پر اسے صرف کرتا چلا جائے اور اپنا معیارِ زندگی زیادہ سے زیادہ بلند کرنے کے سوا اپنی دولت کا کوئی اور مصرف اس کی نگاہ میں نہ ہو:

وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (۶: ۱۴۱)

خرچ میں حد سے نہ گزرو۔ اللہ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (۱۷: ۲۶-۲۷)

فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (۷: ۳۱)

کھاؤ پیو، مگر حد سے نہ گزرو۔ اللہ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

قرآن کی نگاہ میں انسان کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ اپنی ذات پر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے میں اعتدال سے کام لے۔ اس کے مال پر اس کی اپنی ذات کا اور اس کے متعلقین کا حق ہے جسے ادا کرنے میں اس کو بخل بھی نہ کرنا چاہیے لیکن صرف یہی ایک حق نہیں ہے کہ وہ سب کچھ اسی پر لٹا دے اور کوئی دوسرا حق نہ پہچانے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (۱۷: ۲۹)

اور اپنا ہاتھ نہ تو اپنی گردن سے باندھ رکھ (کہ کچھ خرچ نہ کرے)، اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے۔ کہ ملامت زدہ اور حسرت زدہ بن کر بیٹھا رہ جائے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔ (۲۵: ۶۷)

(اور اللہ کے نیک بندے وہ ہیں)، جو خرچ میں نہ اسراف کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا

جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس کے ذریعہ سے آخرت کے گھر کی بہتری کے لیے کوشش کر اور اپنا دنیا کا حصہ

وَاَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ۔ (۲۸: ۷۷)

بھی فراموش نہ کر، اور (خلقِ خدا کے ساتھ) احسان کر جس طرح خدا نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، اور (اپنی دولت کے ذریعہ سے) زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش نہ کر۔

۱۱۔ دولت خرچ کرنے کے صحیح طریقے: معقول حد کے اندر اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے بعد آدمی کے پاس اس کی حلال طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کا جو حصہ بچے اسے خود اِن کاموں پر اس کو صرف کرنا چاہیے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲: ۲۱۹)

لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (راہِ خدا میں) وہ کیا خرچ کریں، کہو جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ۔۔۔۔ (۲: ۱۷۷)

نیکی اس چیز کا نام نہیں ہے کہ تم نے مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لیا، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخر پر اور ملائکہ اور کتاب اور نبیوں پر، اور مال دے اللہ کی محبت میں اپنے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مدد مانگنے والوں کو اور خرچ کرے غلامی سے لوگوں کی گردنیں چھڑانے میں۔۔۔۔۔۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ۔ (۳: ۹۲)

تم نیکی کا مقام ہرگز نہ پا سکو گے جب تک کہ خرچ نہ کرو اپنے وہ مال جو تمہیں محبوب ہیں اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے وہ اللہ کو معلوم ہو گا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَ

اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور نیک سلوک کرو والدین کے ساتھ، رشتہ داروں

الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ
الْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ
السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ
وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَا
اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابًا مُّهِيْنًا وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ
رِئَآءَ النَّاسِ (۴: ۳۶ تا ۳۸)

کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ، رشتہ دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی اور ہم نشین دوست کے ساتھ، مسافر کے ساتھ اور اُن غلاموں کے ساتھ جو تمہارے قبضے میں ہوں۔ درحقیقت اللہ اترانے والوں اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی تلقین کرتے ہیں، اور اُس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے انہیں بخشا ہے۔ ایسے ناشکروں کے لیے ہم نے رسواکن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور وہ جو اپنے مال دکھاوے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ
الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ
بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَ
مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ

(راہِ خدا میں خرچ کے مستحق) وہ تنگ حال لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں ایسے گھر گئے ہیں کہ زمین میں اپنی روزی کمانے کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے،[۱۶] ناواقف آدمی ان کی خودداری کی وجہ سے ان کو غنی سمجھتا ہے، مگر تم ان کے چہروں سے ان کو پہچان

۱۶ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس سے مراد وہ چار سو رضا کار تھے جو عرب کے مختلف حصوں سے اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینے آگئے تھے اور اپنی زندگی انھوں نے اس کام کے لیے وقف کر رکھی تھی کہ تعلیم حاصل کریں اور تبلیغ تعلیم اور جہاد کی جس مہم پر بھی آنحضرت ان کو جب اور جہاں بھیجنا چاہیں بھیج دیں۔ ان خدمات کے لیے اپنا سارا وقت دے دینے کی وجہ سے وہ اپنی معاش کے لیے دوڑ دھوپ نہ کر سکتے تھے (زمخشری: الکشاف: ج ۱، ص ۱۲۶، المطبعۃ البہیہ، مصر ۱۳۴۳ھ)۔ اسی طرح اب جو لوگ اپنا سارا وقت تعلیم، تبلیغ اور اجتماعی بھلائی کے دوسرے کاموں کے لیے وقف کر چکے ہوں اور اپنے ذاتی کاروبار کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ پاتے ہوں وہ اس آیت کے مصداق ہوں گے۔

(۲: ۲۷۳) سکتے ہو، وہ پیچھے پڑ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔ جو کچھ مال تم ان پر خرچ کرو گے اللہ کو اس کا علم ہوگا۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (۷۶: ۸-۹)

(اور نیک لوگ، اللہ کی محبت میں کھانا کھلاتے ہیں مسکین اور یتیم اور قیدی کو اور کہتے ہیں کہ ہم محض اللہ کی خوشنودی کے لیے تمہیں کھلاتے ہیں، تم سے کسی بدلے یا شکریے کے خواہشمند نہیں ہیں۔

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۷۰: ۲۴-۲۵)

(اور دوزخ کی آگ سے محفوظ، وہ لوگ ہیں جن کے مالوں میں ایک طے شدہ حصہ ہے مدد مانگنے والے اور محروم کے لیے (یعنی انہوں نے اپنے مال میں ان کا باقاعدہ حصہ مقرر کر رکھا ہے)

وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتَابَ مِمَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيهِمْ خَيْرًا وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ (۲۴: ۳۳)

اور تمہارے غلاموں میں سے جو (فدیہ دے کر آزادی) حاصل کرنے کا معاہدہ کرنا چاہیں ان سے معاہدہ کر لو اگر تم ان کے اندر کوئی بھلائی پاتے ہو۔ اور (اس فدیہ کی ادائی کے لیے) ان کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے۔

اس خرچ کو قرآن نہ صرف یہ کہ ایک بنیادی نیکی کہتا ہے بلکہ تاکیداً وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ایسا نہ کرنے میں معاشرے کی مجموعی ہلاکت ہے:

وَأَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔ (۲: ۱۹۵)

خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو، اور احسان کرو، اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

۱۲- مالی کفارے اس عام اور رضاکارانہ انفاق فی سبیل اللہ کے علاوہ قرآن مجید بعض گناہوں

یا کوتاہیوں کی تلافی کے لیے مالی کفارے بھی مقرر کرتا ہے۔ مثلاً جو شخص قسم کھا کر توڑ دے اس کے لیے حکم ہے کہ:

فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ (۵ : ۸۹)	اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے جیسا اوسط درجہ کا کھانا تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو۔ یا ان کو کپڑے دینا ہے۔ یا ایک غلام آزاد کرنا۔ مگر جو ایسا نہ کر سکتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔

اسی طرح جو شخص اپنی بیوی کو ماں بہن سے تشبیہ دے کر اپنے لیے حرام کرے پھر اس سے رجوع کرنا چاہے اس کے لیے حکم ہے:

فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَّا .... فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ... فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَإِطْعَامُ سِتِّينَ مِسْكِينًا۔ (۵۸ : ۴)	قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں (شوہر) ایک غلام آزاد کرے .... اور جو غلام نہ پاتا ہو وہ مسلسل دو مہینے کے روزے رکھے .... اور جو اس کی قدرت نہ رکھتا ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

ایسے ہی کفارے حج کے سلسلے میں بھی بعض کوتاہیوں کے معاملہ میں تجویز کیے گئے ہیں (۲ : ۱۹۶۔ ۵ : ۹۵) اور ایسا ہی فدیہ روزوں کے معاملہ میں مقرر کیا گیا ہے (۲ : ۱۸۴)۔

انفاق کے مقبول ہونے کی لازمی شرائط لیکن یہ خرچ قرآن کی رُو سے صرف اسی صورت میں راہِ خدا کا خرچ قرار پا سکتا ہے جبکہ اس میں خود غرضی نہ ہو، ریاکاری اور نمائش نہ ہو۔ احسان جتانے اور اذیت دینے کی کوئی کوشش نہ ہو، اپنا بدتر مال چھانٹ کر نہ دیا جائے بلکہ عمدہ اور بہتر مال دیا جائے، اور اس میں اللہ کی محبت اور اس کی خوشنودی کے سوا کوئی مقصود پیشِ نظر نہ ہو:

وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ	(اور اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا، جو اپنے

وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا

(۴ : ۳۸)

مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور یوم آخر پر ایمان نہیں رکھتے۔ جس شخص کا رفیق شیطان ہوا اس کو بہت ہی بُرا رفیق ملا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

(۲ : ۲۶۴)

اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، اپنے صدقات احسان جتا کر اور اذیت دے کر اس شخص کی طرح ضائع نہ کر دو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخر پر ایمان نہیں رکھتا۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ

(۲ : ۲۶۲ - ۲۶۳)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اپنے خرچ کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ اذیت دیتے ہیں انہی کے لیے اجر ہے ان کے رب کے پاس اور ان کے لیے کسی خوف اور غم کا موقع نہیں ہے۔ ایک بھلی بات اور ایک درگزر کا فعل بہتر ہے اُس صدقہ سے جس کے پیچھے اذیت ہو، اور اللہ بے نیاز اور بُردبار ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ

(۲ : ۲۶۷)

اے لوگو، جو ایمان لاتے ہو، اللہ کی راہ میں خرچ کرو اُن عمدہ چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہیں۔ ردّی چیزیں چھانٹ کر اللہ کی راہ میں نہ دو، حالانکہ اگر وہ تمہیں دی جائیں تو تم ہرگز انہیں نہ لو اِلّا یہ کہ اغماض برت جاؤ۔ خوب جان لو

کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات رکھتا ہے۔	
اگر علانیہ صدقات دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن	اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ
اگر چھپا کر حاجت مند لوگوں کو دو تو یہ تمہارے	وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ
لیے زیادہ بہتر ہے اور تمہاری بہت سی برائیوں	خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ
کو دور کرنے والا ہے، اور جو کچھ تم کرتے	وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲ : ۲۷۱)
ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔	

۱۴۔ **انفاق فی سبیل اللہ کی اصل حیثیت** یہ راہِ خدا کا خرچ، جسے قرآن کبھی اِنفاق، کبھی انفاق فی سبیل اللہ، کبھی صَدَقہ اور کبھی زکوٰۃ کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے، محض ایک نیکی اور خیرات نہیں ہے بلکہ ایک عبادت اور اسلام کے پانچ ارکان ــــــ ایمان، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج ــــــ میں سے تیسرا رکن ہے۔ قرآن مجید میں ۳۷ مقامات پر اس کا اور نماز کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور پورے زور کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں لازمۂ اسلام اور مدارِ نجات ہیں[۱۷]۔ وہ کہتا ہے کہ زکوٰۃ ہمیشہ سے اسلام کا رکن رہی ہے:

---

[۱۷] مثال کے طور پر قرآن مجید کے حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:

۲ : ۳، ۴۳، ۸۳، ۱۱۰، ۱۷۷، ۲۷۷ - ۴ : ۷۷، ۱۶۲ - ۵ : ۱۲، ۵۵ -

۸ : ۳ - ۹ : ۵، ۱۱، ۱۸، ۷۱ - ۱۳ : ۲۲ - ۱۴ : ۳۱ - ۱۹ : ۳۱، ۵۵ -

۲۱ : ۷۳، ۲۲ : ۳۵، ۴۱، ۷۸ - ۲۳ : ۲ - ۲۴ : ۳۷، ۵۶ - ۲۷ : ۳ -

۳۱ : ۴ - ۳۳ : ۳۳ - ۳۵ : ۲۹ - ۴۲ : ۳۸ - ۵۸ : ۱۳ - ۷۰ : ۲۳ - ۷۳ : ۲۰ -

۷۴ : ۴۳ - ۹۸ : ۵ - ۱۰۷ : ۵ -

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلٰوةِ وَإِيتَاءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ۔ (۲۱: ۷۳)

اور اُن کو (یعنی ابراہیم، لوط، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کو) ہم نے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور ان کی طرف ہم نے نیک کاموں کا اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم بھیجا اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ (۹۸: ۵)

اور اہلِ کتاب کو اس کے سوا کسی چیز کا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے، یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اور یہی صحیح دین ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِسْمٰعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا (۱۹: ۵۴-۵۵)

اور ذکر کرو اس کتاب میں اسمٰعیل کا۔ وہ وعدے کا سچا اور رسول نبی تھا اور وہ اپنے متعلقین کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا، اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ آدمی تھا۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللّٰهَ ۔۔۔ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ (۲: ۸۳)

اور یاد کرو، ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو گے ۔۔۔۔ اور یہ کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ آتَانِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا (۱۹: ۳۰-۳۱)

(عیسیٰ ابن مریمؑ نے) کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا اور مجھ کو برکت والا بنایا جہاں بھی میں رہوں، اور مجھے ہدایت دی کہ جب تک زندہ رہوں نماز اور زکوٰۃ کا پابند رہوں

اُسی طرح یہ زکوٰۃ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں بھی دینِ اسلام کا ایک رکن ہے مسلم ملت

میں کسی شخص کے شامل ہونے کے لیے جس طرح ایمان اور نماز ضروری ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی ضروری ہے:

مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرٰهِيمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِينَ ... فَاَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ (۲۲ : ۷۸)

(اللہ نے تمہارے لیے، تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ مقرر کیا ہے، اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے ... پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامے رہو۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ (۲ : ۲-۳)

یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ راہ بتانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو بے دیکھے ماننے والے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ ... اَلَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا (۸ : ۲، ۳، ۴)

مومن تو وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر ان کے سامنے کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ جاتے ہیں ... جو نماز قائم کرتے ہیں اور اُس رزق میں سے خرچ کرتے ہیں جو ہم نے انہیں دیا ہے۔ یہی لوگ حقیقت میں مومن ہیں۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُونَ (۵ : ۵۵)

تمہارے رفیق تو اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ خدا کے سامنے جھکنے والے ہیں۔

فَاِنْ تَابُوا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ (۹ : ۱۱)

پس اگر (مشرکین اپنے شرک سے) توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہو جائیں گے۔

یہ زکوٰۃ صرف معاشرے کی بھلائی ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ خود زکوٰۃ دینے والوں کی اپنی روحانی

ترقی اور اُن کے اخلاق کی درستی اور اُن کی فلاح و نجات کے لیے بھی ضروری ہے۔ یہ ایک ٹیکس نہیں ہے بلکہ نماز کی طرح ایک عبادت ہے۔ انسان کی اصلاحِ نفس کے لیے قرآن جو دستور العمل دیتا ہے یہ اس کا ایک لازمی جزء ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (۹: ۱۰۳)

(اے نبی) ان کے اموال میں سے ایک صدقہ وصول کر کے انہیں پاک کرو اور ان میں اوصافِ حمیدہ کو نشوونما دو، اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو، تمہاری دعا ان کے لیے باعثِ تسکین ہو گی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (۳: ۹۲)

تم نیکی کا مقام کبھی نہ پا سکو گے جب تک کہ اپنی محبوب چیزیں خرچ نہ کرو۔

وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

اور خرچ کرو، یہ تمہارے اپنے ہی لیے بہتر ہے، اور جو دل کی تنگی سے بچ گیا، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

(باقی)

قادیانیوں کے بعض دلائل کا علمی جائزہ[1]

قاضی عبد النبی کوکب

(۲)

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قول ناقابلِ اعتبار اور بے سند اقوال و آثار کے کمزور ستونوں پر استدلال کی یہ ظاہراً اونچی اور پُرشکوہ عمارات اٹھانے کی ایک اور مثال، قادیانی حضرات کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب ہونے والے اس قول سے دلیل پکڑنا ہے، جس میں مزعومہ طور پر یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے "خاتم النبیین" کے الفاظ استعمال کرنے کی تو اجازت دی ہے۔ مگر "لانبیّ بعدہٗ" کے الفاظ کہنے سے منع فرمایا ہے۔ اس قول کی سند اور اس کی صحت کے متعلق آئندہ سطور میں مفصل بحث آرہی ہے۔ مگر اس بحث سے پیشتر ہم قارئین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس قول کو مرزائی مؤلفین نے اپنے دلائل میں کس قدر مایۂ ناز دلیل تصور کیا ہے، اور کس کس انداز میں اس سے استدلال آفرینیاں کی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے بعد جب قادیانی فضلاء نے نئی نبوت کے حق میں آثار و اقوال سے دلیل آفرینی کی مہم شروع کی، تو اس کے ابتدائی دور ہی سے حضرت عائشہ کی طرف منسوب قولِ مذکور کو اپنے اہم دلائل میں سے تصور کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء کی مطبع اختر دکن پریس کی مطبوعہ کتاب "نعم المعانی" میں قادیانیوں کی بعض کتب سے ایسی عبارات کے حوالے دیئے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قول سے استدلال کا آغاز ۱۹۲۳ء سے بہت پہلے ہو چکا تھا:

"اسی طرح حضرت عائشہؓ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ اگر نبوت ہر قسم کی ختم ہو جاتی، تو حضرت

[1] اس مضمون کی پہلی قسط جنوری ۶۴ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ (ادارہ)

عائشہ یہ نہ فرماتیں کہ قولوا انہ خاتم الانبیاء ولا تقولوا لا نبی بعدہٗ۔ یعنی یہ کہو کہ آنحضرت خاتم الانبیاء ہیں۔ لیکن یہ نہ کہو کہ آنحضرت کے بعد کوئی نبی نہیں۔"

(نعم المعانی صفحہ ۱۱۶، ۱۱۷)

"جب حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ" ولا تقولوا لانبی بعدہٗ" یعنی یہ مت کہو کہ آنحضرت کے بعد کوئی نبی نہیں تو اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آئندہ نبی کا پیدا ہونا ممکن ہے۔ اسی لیے حضرت عائشہ نے منع فرمایا۔ اور اگر کوئی نبی آئندہ پیدا ہونے والے نہ ہوتے تو منع نہ فرماتیں۔" (نعم المعانی صفحہ ۱۱۷)

اس کے بعد مرزا صاحب کے خلیفہ میاں صاحب نے مولوی محمد علی صاحب لاہوری کے بقید حیات ہونے کے زمانے میں اسی قول سے اور بھی اچھوتے انداز میں دلیل آفرینی کرتے ہوئے فرمایا:

۱۔۔۔ "یقیناً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان الفاظ کے معنی آخری نبی کے سوا کچھ اور سمجھتی تھیں۔"

۲۔۔۔۔ حضرت عائشہؓ کے اس قول سے کہ لانبی بعدہٗ مت کہو، ایک اور نتیجہ بھی نکلتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ لانبی بعدہ کے فقرہ کے بھی دو معنی ہیں۔ کیونکہ یہ فقرہ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔۔۔۔ حضرت عائشہ کا اس کے استعمال سے منع کرنا، اور لوگوں کا ان کے اس منع کرنے پر اعتراض نہ کرنا بتاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اس جملہ کے دو معنی خیال کرتی تھیں۔ ایک خاتم النبیین کے مطابق اور ایک مخالف۔ چونکہ لوگوں کو اس فقرہ سے دھوکا لگ رہا تھا۔ اس لیے انہوں نے مطلقاً اس فقرہ کے استعمال سے روک دیا۔"

اور حال ہی شائع ہونے والے جدید پمفلٹوں میں، اسی استدلال نے یہ نیا شائل اختیار کر لیا ہے:

"ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا صحابہ کو مخاطب کر کے فرماتی ہیں:

قولوا انہ خاتم الانبیاء ولا تقولوا لا نبی بعدہ (حوالہ ۔۔۔) کہ اے لوگو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء تو ضرور کہو۔ مگر یہ نہ کہو کہ آپ کے بعد کسی قسم کا نبی نہ آئے گا۔ اللہ اللہ! ہماری مادر مشفقہ کا خیال کہاں تک پہنچا۔ آنے والے خطرات کو ۱۴۰۰ سال قبل بھانپ لیا۔ کس لطیف انداز میں فرماتی ہیں کہ اے مسلمانو کبھی لا نبی بعدی کے الفاظ سے ٹھوکر نہ کھانا۔ خاتم النبیین کی طرف نگاہ رکھنا۔ مگر یہ نہ کہنا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔"

اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ جس قول کو قادیانی فضلاء نے بڑی مایہ ناز دلیل کی حیثیت سے بارہا پیش کیا ہے اور جسے ایک مسلّمہ حقیقت ظاہر کر کے نت نئی استدلالی نکتہ آفرینیوں کا منبع بنا رکھا ہے، اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ایسا قول ہے جس کی کوئی سند سامنے نہیں لائی گئی یعنی یہ نہیں بتایا گیا کہ مذکورہ بالا قول، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کن راویوں کے ذریعے سے منقول ہوا ہے۔ احادیثِ نبوی اور اقوالِ صحابہ کی روایت کا معاملہ کوئی کھیل نہیں ہے کہ جب جس کے جی میں آئے، کوئی بات حضورؐ کی طرف منسوب کر دے، یا کسی قول کی نسبت، آپ کے صحابہ و اہلِ بیتؓ کی طرف کر دے اور توقع یہ رکھے، کہ بس اس طرح کے منسوب اقوال و آثار سن کر امت کی گردنیں جھک جائیں گی، اور کوئی یہ دریافت نہیں کریگا کہ حضرت! یہ روایت جو آپ پیش فرما رہے ہیں، راویوں کے کس سلسلے سے مروی ہوئی ہے، اور آپ تک کس سند کے ذریعے سے پہنچی ہے۔ اگر یہ معاملہ ایسا ہی غیر ذمہ دارانہ ہوتا تو علمائے حدیث کو راویوں کی تحقیق و تفتیش میں عمریں کھپا دینے کی کیا ضرورت تھی؟

قادیانی فضلاء اس قول کے سلسلے میں دو کتابوں کا نام پیش کرتے ہیں۔ ایک درِ منثور، اور دوسری تکملہ مجمع البحار۔ مگر ان دونوں کتابوں میں کہیں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول کی کوئی سند بیان نہیں کی گئی ہے۔ اور جہاں تک ہماری اطلاع کا تعلق ہے، اس قول کے سلسلے میں ان مذکورہ بالا دو کتابوں کے علاوہ کسی تیسری کتاب کا نام پیش نہیں کیا گیا۔ اس لیے یقیناً قادیانی

حضرات خود بھی یہ جانتے ہیں کہ ان کا پیش کردہ "قولِ عائشہ" ایک قولِ بے سند ہے۔ مگر اس کے باوجود اس پر استدلال کے ردے سے پڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

پھر اس قول کے بے سند ہونے کا یہ اعلان کوئی آج پہلی بار نہیں کیا جارہا ہے بلکہ اس کی تاریخ کم از کم تیس سال پرانی ہے۔ قادیانیوں کے معتقدات و مزعومات کے سلسلے میں مناظرانہ مگر معقول بحث کے لیے معروف کتاب محمدیہ پاکٹ بک کا دوسرا ایڈیشن، یکم جنوری ۱۹۳۶ء تک شائع ہوچکا تھا جس کے صفحہ ۳۹۹ پر اسی قولِ زیرِ بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مرزائی عذر: حضرت عائشہ نے فرمایا ہے کہ خاتم النبیین تو کہو، مگر لا نبی بعدی نہ کہو۔ یہ روایت بے سند محض ہے۔" نیز اسی کتاب کے صفحہ ۶۰۴ پر اس قول سے دوبارہ بحث کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے:

"دلیل مرزائیہ: حضرت عائشہ فرماتی ہیں قولوا خاتم النبیین ولا تقولوا لا نبی بعدہٗ، یعنی خاتم النبیین کہو، مگر لا نبی بعدہٗ نہ کہو۔ اس کا جواب گزرچکا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ یہ بے سند قول ہے۔"

گو واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ کتاب کے مذکورہ سالِ اشاعت سے بھی ایک عرصہ پہلے، علماءِ اُمت، اس قول کے بے سند ہونے کا اعلان کرچکے تھے۔ تاہم اگر مذکورہ سال ۱۹۳۶ء ہی کو وہ پہلا موقع قرار دے لیا جائے جبکہ قادیانیوں کو یہ چیلنج کیا گیا کہ تم اس قول کی سند پیش کرو، تب بھی اس چیلنج پر اب تیس سال گزرنے کو ہیں۔ مگر اس قول کی کوئی سند، جہاں تک ہمیں معلوم ہے، قادیانیوں کی طرف سے پیش نہیں کی جاسکی۔

علمی دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ اس واضح صورتِ حال کے پیشِ نظر، قادیانی حضرات آئندہ کے لیے اس قول سے دلیل پکڑنے کا سلسلہ ترک کردیتے۔ مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نہ تو وہ قولِ زیرِ بحث کی سند پیش کرتے ہیں اور نہ اس سے استدلال کا سلسلہ ہی ترک کرتے ہیں۔ بلکہ بار بار، رنگا رنگ کی عبارت آرائیوں سے، کمال بے تکلفی کے ساتھ، قولِ مذکور کو اپنی ایک مسلّم و مستحکم دلیل کے طور پر پیش کرتے چلے

جاتے ہیں۔ چنانچہ محمدیہ پاکٹ بک کے مذکورہ اعلان (کہ یہ قول بے سند محض ہے) سے سترہ برس بعد میاں بشیرالدین صاحب کی کتاب " دعوت الامیر " ربوہ سے، دسمبر ۱۹۵۲ء میں طبع ہوئی ہے اور اس میں پھر بڑے طمطراق کے ساتھ اسی قولِ بے سند کو بنائے استدلال بنایا گیا ہے :

" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ قولوا انہ خاتم الانبیاء ولا تقولوا لا نبی بعدہٗ یعنی اے لوگو یہ تو کہو کہ آپ خاتم النبیین تھے مگر یہ نہ کہو کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اگر حضرت عائشہ کے نزدیک رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کا نبی بھی نہیں آسکتا تھا تو آپ نے لانبی بعدہٗ کہنے سے لوگوں کو کیوں روکا۔ اور اگر اُن کا خیال درست نہ تھا، تو کیوں صحابہ نے ان کے قول کی تردید نہ کی۔ پس اُن کا لانبی بعدہٗ کہنے سے روکنا بتاتا ہے کہ ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی تو آسکتا تھا۔ مگر صاحبِ شریعت نبی، یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آزاد نبی نہیں آسکتا تھا۔ اور صحابہ کا آپ کے قول پر خاموش رہنا بتاتا ہے کہ باقی سب صحابہ بھی ان کی طرح اس مسئلہ کو مانتے تھے " (دعوت الامیر صفحہ ۳۸)

میاں صاحب کے پیدا کردہ نکات کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا لیکن افسوس یہ ہے کہ اُن کے پُرزور استدلالات کی پوری عمارت ہوا میں کھڑی ہے۔ وہ اوپر ہی اُوپر، استدلالی نکتے پہ نکتہ پیدا کرتے چلے گئے ہیں۔ لیکن اُس قول کی بنیاد کو ثابت و قائم کرنے کی ذرا زحمت گوارا نہیں فرمائی جس پر استدلال کا یہ سارا بوجھ ڈالا ہے۔

اسی طرح پمفلٹ " ختم نبوّت اور بزرگانِ امت "، جو حال میں شائع ہُوا ہے، بدستور حضرت عائشہ کی طرف منسوب اس قول سے بڑے شدومد کے ساتھ استدلال کرتا ہے جس کا اقتباس پیچھے گزر چکا ہے۔ اِن تمام باتوں سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ قادیانی استدلالات میں علمی اصولوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔

ہم نے سند کے اس مبحث کو عمداً پھیلا کر لکھا ہے۔ کیونکہ ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قادیانیوں کے پیش کردہ دلائل میں، غالب قدرِ مشترک اسی قسم کی مغالطہ آفرینیاں ہی ہوتی ہیں۔ وہ جن چند روایات

اور اقوال و آثار کا سہارا لیتے ہیں، ان کے پیش کرنے میں ان کا "ماہرانہ طریقہ" یہی ہوتا ہے کہ وہ اصل قول یا روایت کی علمی واقفیت، یا اصولی حیثیت کی بحث سے دامن بچا کر فوراً ہی عربی عبارت کا ترجمہ کر ڈالتے ہیں۔ اور اس پر اپنے استدلال کا عمل شروع کر دیتے ہیں پھر وہ بات سے بات اور نکتے پہ نکتہ اس تیز رفتاری کے ساتھ پیدا کرتے چلے جاتے ہیں کہ عوام کے ذہن ان کے پیش کردہ اقوال کی علمی حقیقتِ حال کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہ پا سکیں۔ نیز اس بحث پر مفصل گفتگو کرنے سے ہمارا مدعا یہ بھی ہے کہ مطالبۂ سند کے اس واضح چیلنج کا، قادیانی مؤلفین نے پہلے کوئی جواب نہیں دیا۔ تو اب ہی اگر کوئی سند اس قول کی انہیں مل گئی ہو، تو اسے منظرِ عام پر لے آئیں۔ تاکہ گفتگو علم و تحقیق کے صحیح خطوط پر چل سکے۔

اصولی اور علمی اعتبار سے، ہماری یہ بحث، سند کے مطالبے پر مکمل ہو جاتی ہے۔ ہماری حجت تمام ہے، اور ہمیں مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاوقتیکہ ہمارے مخاطبین قولِ مذکور کی سند سامنے لائیں، اور پھر سند کے درجہ اور اس کے راویوں کے احوال سے بحث شروع ہو۔ لیکن ہمیں کچھ یقین سا ہے کہ مخاطبین موصوفین، بحث کے اس اصولی نہج پر کبھی نہیں آئیں گے۔ بلکہ عربی عبارت کا ترجمہ کرتے ہوئے عوام سے یہی کہتے رہیں گے کہ دیکھیے حضرت عائشہ نے یہ فرمایا ہے۔ اور ان کے فرمانے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ نبوت کو بند نہیں سمجھتی تھیں۔

چونکہ عربی سے ناواقف، اور سند و رُواۃ کی علمی ابحاث سے بے خبر عوام میں، حضرت عائشہ کے اس قول کے ترجمے اور من مانی تاویل سے، قادیانی حضرات کے لیے غلط فہمی پھیلانے کا کافی موقع ہے۔ اس لیے اس قول کی سند کا مطالبہ کرنے، اور جب تک اس کی سند پیش نہیں کی جاتی، اسے بے سند اور ناقابلِ استدلال قول، قرار دینے کا اپنا علمی اور اصولی موقف برقرار رکھتے ہوئے، ہم اس بے اصولی اور چیرہ دستی کی طرف بھی قارئین کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں جو اس قول کے معانی و مطالب کے بیان کرنے میں قادیانی حضرات روا رکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ علمی اصولوں سے ثابت نہ کر سکنے کے باوجود

اگر آپ کو یونہی اصرار ہے کہ قول زیر بحث واقعی حضرت عائشہ کا قول ہے۔ اور واقعی آپ نے یہ فرمایا تھا کہ حضورؐ کو خاتم الانبیاء کہو مگر لانبی بعدہ نہ کہو، تو بھی سوال یہ ہے کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عائشہ کا عقیدہ یہ تھا کہ حضورؐ کے بعد نبی آسکتے ہیں۔ اور آپ کس قرینے سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ لانبی بعدہ کہنے سے آپ نے اس لیے منع فرمایا تھا کہ آپ کے خیال میں حضورؐ کے بعد اور نبی پیدا ہوئے تھے۔

اس سوال کو زیادہ اہمیت اس لیے حاصل ہو جاتی ہے کہ "لانبی بعدہ" کہنے سے روکنے کی دوسری وجہ جو (اس قول کے صحیح ثابت ہو جانے کی صورت میں) ہمارے نزدیک اس کی اصل وجہ ہو سکتی ہے۔ اپنی تائید پر مضبوط قرائن و شواہد رکھتی ہے۔ اور وہ دوسری وجہ یہ ہے کہ "لانبی بعدہ" کے الفاظ سے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کے متعلق بظاہر شبہ پیدا ہو سکتا تھا۔ ازواج مطہرات اور صحابہ کرام، جس طرح ختم نبوت کے عقیدے پر کامل یقین رکھتے تھے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی کا مسئلہ بھی ان کے معتقدات میں شامل تھا۔ کیونکہ ان حضرات نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات بار بار سنے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے تشریف لائیں گے۔ ان حضرات میں سے بعض کو یہ بات کھٹکی کہ اگر حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی کا انکار کرنے والا کوئی گروہ پیدا ہو گیا، تو ممکن ہے کہ وہ "لانبی بعدی" کے الفاظ سے استدلال کرے اور کہے کہ جس طرح حضور کے بعد کوئی نیا نبی پیدا نہیں ہو سکتا، اسی طرح پہلے ہو چکنے والے انبیاء میں سے بھی کوئی حضورؐ کے بعد ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کا کوئی امکان نہیں۔ اور اس طرح ان تمام احادیث کا انکار کر دیا جائے جو حضرت مسیح کی دوبارہ آمد کی صاف اطلاع دیتی ہیں۔ اس لیے بعض صحابہ نے عوام کو اس مسئلے کا حل یوں سمجھانا مناسب سمجھا کہ وہ ایسے مواقع پر "لانبی بعدہ" کے الفاظ کے بجائے "خاتم الانبیاء" کے الفاظ بولا کریں۔ کیونکہ ان الفاظ میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں نکالی جاسکتی۔ وجہ ظاہر ہے کہ سلسلۂ انبیاء کے ختم کرنے کا مفہوم ہی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ جتنے انبیاء پیدا ہونے تھے۔ حضورؐ سے پہلے پیدا ہو چکے۔ آپ کے بعد کوئی نیا نبی پیدا نہیں ہوگا۔ اور جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے، سو وہ پہلے گروہ انبیاء ہی کے ایک فرد ہیں۔ چنانچہ وہی تفسیر درّ منثور

جو قادیانی حضرات کے ہاں اس حد تک پایۂ اعتماد کو پہنچتی ہے کہ اس میں درج ہونے والے حضرت عائشہ کے قولِ مذکور کو، سند نہ ہونے کے باوجود قابلِ استدلال سمجھ لیا گیا ہے۔ اسی درِ منثور کے اسی صفحے پر حضرتِ عائشہ کے قول کے بعد متصل ہی حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا درج ذیل قول بھی نقل کیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ قادیانی فضلاء اس قول کو بھی اسی طرح قابلِ استدلال سمجھیں گے جس طرح انہوں نے حضرت عائشہ کے قول کو قابلِ استدلال قرار دیا ہے۔

(اخرج ابن ابی شیبۃ عن الشعبی رضی اللہ عنہ قال قال رجلٌ عند المغیرۃ بن شعبۃ صلی اللہ علیٰ محمد خاتم الانبیاء لا نبی بعدہٗ فقال المغیرۃ حسبک اذا قلت خاتم الانبیاء فانا کنا نحدث ان عیسیٰ علیہ السلام خارج فان ھو خرج فقد کان قبلہ وبعدہ

(درِ منثور ج ۵ ص ۲۰۴)

ابن ابی شیبہ نے امام شعبی سے نقل کیا ہے! انہوں نے بتایا کہ ایک شخص نے مغیرہ بن شعبہ کے پاس حضور کو "خاتم الانبیاء لا نبی بعدہٗ" کہہ کر آپؐ پر درود بھیجا تو حضرت مغیرہ نے کہا: "خاتم الانبیاء" کہہ دینا ہی کافی تھا کیونکہ ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ظہور فرمانا ہے۔ چنانچہ اگر آپ ظہور پذیر ہوئے تو آپ کی حیثیت یہ ہوگی کہ آپ حضورؐ سے پہلے بھی ہو چکے ہیں، اور اب بعد میں بھی آئیں گے۔

حضرتِ مغیرہ رضی اللہ عنہ کے اس قول سے جو مرزائیوں پر خود ان کے اپنے ہی اصولِ استدلال کے مطابق حجت ہے، یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ کے زمانے میں ایک دوسرے معروف صحابی نے بھی عوام کے لیے "لانبی بعدی" کے فقرے سے ایک شبہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ محسوس کیا تھا۔ اور وہ شبہ یہ تھا کہ کہیں اس فقرے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کا انکار نہ کر دیا جائے۔ تو انہوں نے عوام کے لیے آسان راہ یہی سمجھی کہ وہ ایسے شبہات کے مقابلے میں "لانبی بعدی" کے بجائے "خاتم الانبیاء" کے الفاظ بول لیا کریں۔ کیونکہ ان الفاظ میں ختم نبوت کا صحیح مفہوم ہونے کے ساتھ آمدِ مسیح کے انکار کے لیے استعمال ہونے کی گنجائش موجود نہیں۔

اب ہم یہ کہتے ہیں کہ قادیانیوں کی طرف سے پیش کردہ قولِ عائشہؓ اور اوپر مذکور ہونے والا قولِ مغیرہؓ دونوں اتنی بات میں مشترک ہیں کہ ان میں کسی خاص وجہ کے پیشِ نظر" لانبی بعدہ" کے الفاظ سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن اس ممانعت کی وجہ کیا ہے ؟ اس کا بیان حضرت عائشہ کی طرف منسوب قول میں نہیں ملتا، اور حضرت مغیرہ کے قول میں ملتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ حضرت عائشہ کے قول کا مفہوم وہی نہ سمجھا جائے جو حضرت مغیرہ کے قول میں پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ جبکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ دونوں شخصیتیں ایک ہی دَور میں تھیں، اور دونوں کے سامنے ایک ہی قسم کی ذہنی فضا تھی۔

یہی وجہ ہے کہ جن دو کتابوں کا حوالہ قولِ زیرِ بحث کے سلسلے میں خود قادیانی حضرات کی طرف سے دیا گیا ہے ان کے مصنفین میں سے ایک نے اشارۃً اور دوسرے نے صراحتاً حضرت عائشہ کے قول کو اسی محمل پہ رکھا ہے جس پر حضرتِ مغیرہ کا قول ہے۔ دُرِ منثور کے مؤلف نے ہر دو اقوال کو ایسی ترتیب سے درج کیا ہے جس سے گویا وہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہ دونوں قول ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ اور ان میں سے دوسرا پہلے کی تفسیر کر رہا ہے۔ دیکھیے دُرِ منثور میں یہ اقوال اس طرح مندرج ہیں:

۱۔ واخرج ابن ابی شیبۃ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا، قالت قولوا خاتم النبیین ولا تقولوا لا نبیّ بعدہٗ	۱۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت عائشہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے کہا: "خاتم النبیین" کہو۔ اور "لانبی بعدہ" نہ کہو۔
۲۔ واخرج ابن ابی شیبۃ عن الشعبی رضی اللہ عنہ قال قال رجل عند المغیرۃ بن شعبۃ صلی اللہ علی محمد خاتم الانبیاء فانا کنا نحدث ان عیسیٰ علیہ السلام خارج فان ھو خرج فقد کان قبلہ وبعدہٗ	۲ اور ابن ابی شیبہ نے امام شعبی سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے بتایا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے پاس کسی شخص نے "خاتم الانبیاء" اور "لانبی بعدہ" کہتے ہوئے حضور پر درود بھیجا تو حضرت مغیرہ نے فرمایا: "خاتم الانبیاء" کہنا ہی کافی ہے کیونکہ ہمارے ہاں یہ تذکرہ رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ظہور فرمائیں گے۔
(دُرِ منثور ج ۵ ص ۲۰۴)	

یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آسکی کہ حضرت مغیرہ کے قول کے اس واضح معقول اور قریب تر توجیہ کے ہوتے ہوئے قادیانی فضلاء حضرت عائشہ کی طرف منسوب قول کا یہ مفہوم کہاں سے نکال لائے ہیں کہ آپ نے "لا نبی بعدہ" کہنے سے اس لیے روکا تھا کہ آپ کے عقیدے میں حضورؐ کے بعد اور نبی پیدا ہو سکتے تھے۔ دوسری کتاب "تکملہ مجمع البحار" کے مؤلف شیخ ابو طاہر تو قول زیر بحث کو لائے ہی محض اس لیے ہیں کہ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی کے مسئلے کی تائید ہوتی ہے۔ "مجمع البحار" دراصل لغت کی کتاب ہے۔ اور مؤلف "زی د" کے مادے کی تشریح کرتے ہوتے، نزول عیسیٰ کے متعلق وہ روایت نقل کرتے ہیں جس میں "یزید (مادہ: زی د) فی الحلال" کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں سے "یزید" جو مادہ "زی د" سے مضارع کا صیغہ ہے، کی تشریح مقصود ہے لیکن چلتے چلتے حضرت عیسیٰ کی آمد ثانی کی تائید کے لیے حضرت عائشہ کی طرف منسوب قول مذکور بھی نقل کر دیا ہے "تکملہ مجمع البحار" کے اس مقام پر عبارت یوں ہے:

مغیث فی ح عیسیٰ انہ یقتل الخنزیر ویکسر الصلیب ویزید فی الحلال ای یزید فی حلال نفسہ بان یتزوج ویولد لہ وکان لم یتزوج قبل رفعہ الی السماء فزاد بعد الھبوط فی الحلال فح یومن کُلّ احدٍ من اھل الکتاب للتیقن بانہ بشرٌ وعن عائشۃ قولوا انّہ خاتم الانبیاء ولا تقولوا لا نبی بعدہ وھذا ناظرٌ الی نزول عیسیٰ . . . .

"۔۔۔۔ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ہے کہ وہ خنزیر کو ہلاک کر دیں گے، صلیب توڑ ڈالیں گے۔ اور حلال میں اضافہ کریں گے، یعنی اپنے حق میں: اور وہ اس طرح سے کہ آپ نکاح کریں گے اور آپ کی اولاد ہو گی۔ آپ نے آسمان کی طرف اٹھائے جانے سے پہلے نکاح نہیں کیا تھا۔ پس آسمان سے نازل ہو کر اس حلال چیز کا اپنے لیے اضافہ کریں گے۔ اس وقت اہل کتاب میں سے ہر شخص ایمان قبول کرے گا۔ کیونکہ یہ بات یقین سے معلوم ہو جائے گی۔ کہ آپ بشر ہیں۔ اور حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ حضورؐ کو "خاتم الانبیاء" کہو اور "لا نبی بعدہ" نہ کہو۔

(تکملہ مجمع البحار ص ۸۵) اور حضرت عائشہ نے جو یہ فرمایا ہے کہ "لانبی بعدہ" نہ کہو تو یہ حضرت عیسیٰ کے نازل ہونے کے پیش نظر فرمایا ہے"۔

ان عبارات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جن مؤلفین کے حوالے سے قولِ زیرِ بحث پیش کیا جاتا ہے، خود انہیں اس بات میں قطعاً شبہ نہ تھا کہ حضرت عائشہ کی طرف منسوب اس قول کا مفہوم وہی ہے جو حضرت مغیرہ کے قول کا ہے۔ یعنی حضرت عائشہ نے اگر "لانبی بعدہ" کہنے سے عوام کو روکا تو صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمدِ ثانی کا خیال مدنظر رکھتے ہوئے روکا۔

مزید برآں ہم یہ کہتے ہیں کہ قولِ زیرِ بحث کا منشاء معلوم کرنے کے لیے اُن احادیثِ نبوی کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خود حضرتِ عائشہ نے سُنی اور نقل فرمائیں اور جو حضورؐ کی ختمیت کے مفہوم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کی خبر پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ حدیث کی مستند اور مسلّم کتابوں میں، یہ حدیث حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ذریعے سے منقول ہوتی ہے:۔

عن عائشۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال لا یبقی بعدہ من النبوۃ الا المبشرات قالوا یا رسول اللہ ما المبشرات؟ قال الرؤیا الصالحۃ یری المسلم او یُری لہ

(مسند امام احمد)

حضرت عائشہ کے ذریعے سے حضورؐ سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ آپ کے بعد نبوت میں سے کچھ باقی نہ رہے گا، فقط مبشرات باقی رہیں۔ اس پر لوگوں نے دریافت کیا، مبشرات کیا چیز ہے؟ تو آپ نے جواب دیا: وہ رویائے صالحہ، جو کوئی مسلمان خود دیکھے یا اس کے حق میں کسی دوسرے کو دکھایا جائے۔

یہ حدیث صراحت کے ساتھ بتاتی ہے کہ حضورؐ کے بعد نبوت کی قبیل کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ اور نبوت کی کوئی قسم، یا کوئی جزو، آئندہ کے لیے ہرگز جاری نہیں۔ ہاں البتہ رویائے صالحہ

مسلمانوں میں موجود رہے گی۔ چونکہ یہ حدیث، خود حضرتِ عائشہ نے حضور سے سُنی اور نقل کی ہے اس لیے اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، کہ حضورؐ کا یہ صریح فرمان سننے کے باوجود انہوں نے اپنا عقیدہ یہ بنا لیا ہو کہ بے شک حضور کے بعد نبی پیدا ہوا کریں گے۔ اور اس امر کی بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپ نے "لانبی بعدہٗ" کہنے سے اس لیے منع کیا ہو، کہ آپ کے عقیدے کے مطابق آئندہ مزید نبی پیدا ہونے والے تھے۔

لہٰذا اگر حضرتِ عائشہ سے واقعی یہ قول ثابت ہو جائے کہ آپ نے "لانبی بعدہٗ" کہنے سے منع کیا تھا، تو اس ممانعت کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ آپ حضرت عیسیٰ کی آمدِ ثانی کے انکار کا دروازہ بند کرنا چاہتی تھیں۔ کیونکہ ایک دوسری حدیث، جو ہم یہاں درج کرنا چاہتے ہیں، یہ بتاتی ہے کہ حضرتِ عیسیٰ کے ظہور پذیر ہونے کی اطلاع حضرتِ عائشہ نے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی تھی۔ اس لیے یقیناً آپ اسے مخبرِ صادق کی خبرِ صادق مانتی تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ امّتِ مسلمہ میں اس خبرِ نبوی کے بارے میں شبہات پھیلنے کا کوئی امکان رہ جائے:

حدثنا عبد اللہ حدثنی ابی ثنا سلیمان بن داؤد قال ثنا حرب بن شدادؔ عن یحییٰ بن ابی کثیر قال حدثنی الحضرمی بن لاحق ان ذکوان ابا صالح اخبرہ ان عائشۃ اخبرتہ قالت دخل علیّ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لی ما یبکیکِ؟ قلت یا رسول اللہ ذکرتُ الدجال فبکیتُ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یخرج الدجالُ وانا حیٌّ کفیتکموہ وان

امام احمد فرماتے ہیں مجھے عبد اللہ نے حدیث سنائی اور عبد اللہ کو اس کے والد نے، اور اس کے والد کو سلیمان بن داؤد نے حدیث سنائی۔ سلیمان نے حرب بن شدّاد سے سُنی۔ حرب نے یحییٰ بن ابی کثیر سے سُنی۔ اور یحییٰ نے حضرمی بن لاحق سے سُنی حضرمی کو ذکوان ابو صالح نے بتایا کہ اسے حضرتِ عائشہ نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ حضور میرے پاس ایسے وقت تشریف لائے جبکہ میں رو رہی تھی۔ چنانچہ آپ نے دریافت فرمایا "تمہیں کس چیز نے رولایا ہے؟" میں نے عرض کیا اے

یخرج الدجال بعدی فان ربکم عزّ و جل لیس باعور۔ انہ یخرج فی یھودیۃ اصبھان حتی یاتی المدینۃ فینزل ناحیتھا ولھا یومئذ سبعۃ ابواب علیٰ کلّ نقبٍ منھا ملکان فیخرج الیہ شرار اھلھا... حتّیٰ یاتی فلسطین باب لُدّ فینزلُ عیسیٰ علیہ السلام فیقتلہ ثم یمکث عیسیٰ علیہ السلام فی الارض اربعین سنۃً اماماً عدلاً وحکماً مقسطا۔

(مسند امام احمد مطبوعہ مطبعہ میمنیہ مصر جلد ۶ ص ۷۵)

اللہ کے رسول مجھے دجّال کا خیال آگیا تھا، اس لیے مَیں رو پڑی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: اگر دجّال میرے ہوتے ہوئے آگیا تو مَیں تم لوگوں کی طرف سے اس کے لیے کافی ہوں گا۔ اور اگر وہ میرے بعد نکلا تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارا پروردگار کانا نہیں ہے۔ وہ (دجّال) یہودیہ اصبہان سے خروج کرے گا، اور مدینہ آئے گا۔ یہاں وہ حدودِ شہر کے نزدیک اترے گا۔ اس وقت مدینہ کے سات دروازے ہونگے۔ ہر ایک پر دو فرشتے مقرر ہوں گے۔ پس علاقے کے بدمعاش لوگ اس کے اردگرد جمع ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ علاقۂ فلسطین کی طرف بڑھے گا اور جب بابِ لُد پر پہنچے گا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہو جائیں گے۔ چنانچہ آپ دجّال کو قتل کر دینگے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ، زمین میں ایک عادل رہنما اور ایک با انصاف حکمران کی حیثیت سے چالیس سال تک زندہ رہیں گے۔

ان پچھلی سطور میں ہم نے تین واضح قرائن سے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب قولِ زیرِ بحث کی صحت پایہ ثبوت کو پہنچ بھی جاتی، تو بھی آپ کے "لا نبی بعدہٗ" کہنے سے روکنے کی ممکن وجہ صرف یہی تھی کہ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کے بارے میں عوام کو شبہات سے بچانا چاہتی تھیں یعنی آپ کو اندیشہ تھا کہ کہیں "لا نبی بعدہٗ" کا غلط مفہوم

نکال کر حضرت عیسیٰ کی آمدِ ثانی کا انکار نہ کر دیا۔ باقی رہا اس قول سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آپ حضورؐ کے بعد نئے نبیوں کے پیدا ہونے کا عقیدہ رکھتی تھیں، سو یہ محض حضرت عائشہ پر ایک افترا ہے جس کی ان کے قول میں نہ کوئی گنجائش ہے اور نہ اس کی تائید پر کوئی قرینہ ہے۔

ہم نے پہلی تائید حضرت مغیرہؓ کے قول سے پیش کی ہے جو حضرت عائشہ کے قول کی پوری وضاحت کر رہا ہے۔ کیا قادیانی حضرات اس سلسلے میں کسی ایک صحابی کا کوئی ایک قول ایسا پیش کریں گے جس سے اُس مفہوم کی تائید ہوتی ہو جو مفہوم قولِ مذکور سے وہ خواہ مخواہ کھینچ کر نکالنا چاہتے ہیں؟

ہماری پیش کردہ دوسری تائید خود اُن مؤلفین کے ذہنی رجحان پر مبنی ہے جنہوں نے قولِ زیرِ بحث کو نقل کیا ہے، اور اس کی اسی توجیہ کی طرف رہنمائی کی ہے جو حضرت مغیرہ کے قول میں صراحتہً پائی جاتی ہے۔ کیا قادیانی حضرات کسی ایک ایسے مؤلف کا جس نے قولِ مذکور کو نقل کیا ہو، کوئی ادنیٰ اشارہ بھی ایسا دکھائیں گے جو اُن کی مزعومہ تفسیر کی تائید کرتا ہو؟

اور تیسری تائید ہم نے ان مرفوع احادیثِ نبوی سے حاصل کی ہے جو خود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ذریعے سے منقول ہوئی ہیں۔ اور جن سے کمالِ وضاحت کے ساتھ یہ ثابت ہوتا ہے کہ ختمِ نبوت اور نزولِ مسیح کے بارے میں حضرت عائشہؓ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات معلوم تھے جن کی روشنی میں حضرت عائشہ کی طرف منسوب، قولِ زیرِ بحث کی کوئی اور توجیہ ممکن ہی نہیں، سوائے اس توجیہ کے جو حضرت مغیرہ کے قول سے معلوم ہوتی ہے۔ کیا اس کے مقابلے میں قادیانی فضلاء کی طرف سے اسی نوعیت کی کوئی ایک حدیث بھی پیش کی جانے گی جو خود حضرت عائشہ نے حضورؐ سے سُنی ہو، اور جو حضرت عائشہ کے لیے اس عقیدے کا امکان پیدا کر سکتی ہو، جو یہ حضرات ان کے سر تھوپ رہے ہیں؟

قارئین تفہیم القرآن کے لیے ایک ضروری اعلان

تفہیم القرآن جلد اوّل و دوم کے تازہ ترین ایڈیشنوں میں بعض مقامات پر ترجمہ میں اصلاحات کی گئی تھیں۔ مگر افسوس ہے کہ پریس میں تصحیح ٹھیک طریقہ سے نہیں ہو سکی۔ اس لیے قارئینِ تفہیم القرآن سے درخواست ہے کہ وہ درجِ ذیل تین مقامات کو از سرِ نو درست کر لیں۔

۱۔ تفہیم القرآن جلد اوّل صفحہ ۴۰۶ پر ترجمے کی پہلی سطر کا آخری فقرہ یوں تحریر کریں:

"بہر حال اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے"

دوسری سطر کے شروع کا حصہ "کہ تم اس کا لحاظ کرو" زائد ہے، اسے کاٹ دیا جائے۔

۲۔ تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۱۷۵ پر ترجمے کی آخری سطر میں "حج کے بڑے دن" کے بجائے "حج اکبر کے دن" تحریر کیا جائے۔ اسی صفحے کے آخری حاشیہ نمبر ۴ کی دوسری سطر کے آخر میں "یہ حج کا بڑا دن ہے" کے بجائے "یہ حج اکبر کا دن ہے" لکھا جائے اور اس کے بعد کی آخری دو سطروں کو کاٹ کر ان کے بجائے یہ عبارت لکھی جائے:

"حجِ اکبر کا لفظ حج اصغر کے مقابلے میں ہے۔ اہلِ عرب عمرے کو چھوٹا حج کہتے تھے۔ اس کے مقابلے میں وہ حج جو ذی الحجہ کی تاریخوں میں ہوتا ہے، حج اکبر کہلاتا ہے۔"

۳۔ تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۲۷۲ پر ترجمے کی دوسری سطر یوں لکھی جائے:

"اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن تم کو کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔"

ترجمے کی دوسری سطر میں اور نہ اللہ کے بجائے "اور اللہ" لکھا جائے۔ اور تیسری سطر کے شروع کا لفظ "تھا" کاٹ دیا جائے۔

رسائل و مسائل

صفاتِ الٰہی میں تناقض ہے یا مطابقت؟

سوال: آپ نے تفہیمات حصہ اول کے مضمون "کوتہ نظری" میں کسی مستفسر کے اِس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ "اللہ رحم و کرم اور رافت و شفقت کا منبع ہونے کے باوجود چھوٹے اور معصوم بچوں پر مصائب اور تکالیف کیوں وارد کرتا ہے؟" خدائی نظام میں وقوع پذیر ہونے والے "شرور" کی عقلی توجیہ کے لیے مندرجۂ ذیل مفروضات کا سہارا لیا ہے:

۱- خدا کے پیشِ نظر پوری کائنات کا اجتماعی مفاد ہے جسے آپ خیر کل سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲- خیر کل کا حصول کسی نظام ہی کے ذریعے ممکن ہے اور چونکہ اللہ حکیم و دانا ہے لہٰذا اس نے ضرور اس مقصد کے لیے کسی ایسے نظام ہی کو منتخب کیا ہوگا جو اپنی کارکردگی اور افادیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ بہتر ہو۔

۳- اگر موجودہ نظام سے زیادہ بہتر کوئی ایسا نظام ہوتا جس میں ان شرور کے وقوع کے بغیر خیر کلی کا حصول ممکن ہوسکتا تو یقیناً اللہ اس بہتر نظام کو منتخب کرتا۔

آپ نے اللہ کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جب ہماری خواہشات کا علم رکھنے کے باوجود اس نے ان کو پورا کرنے سے انکار کیا تو ہم کو سمجھنا چاہیے کہ ایسا کرنا یقیناً ناگزیر ہوگا اور اس علیم و خبیر کے علم میں اس سے بہتر کوئی دوسری صورت نہ ہوگی ورنہ وہ اس بہتر صورت ہی کو اختیار کرتا کیونکہ وہ حکیم ہے اور حکیم کے حق میں یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ اگر بہتر تدبیر ممکن ہو تو اسے چھوڑ کر بدتر صورت اختیار کرے گا۔"

مذکورۂ بالا اقتباس کا ایک جملہ "علیم و خبیر کے علم میں اس سے بہتر کوئی دوسری صورت نہ ہوگی ورنہ وہ اس بہتر صورت ہی کو اختیار کرتا" نہ صرف اجتماعِ نقیضین کی ایک واضح مثال پیش کرتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات علیم و خبیر، حکمت و دانائی کا بھی قاری کے ذہن میں عجیب و غریب خاکہ مرتب کرتا ہے۔ اللہ کو علیم و خبیر مان لینے کے بعد اس کے علم کو کسی خاص "صورت" یا "تدبیر" تک محدود کر دینا بجائے خود اس کے علیم و خبیر ہونے کی نفی کرتا ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اللہ واقعی کسی ایسے نظام کو نافذ کرنے پر قادر تھا جس میں ان "شرور" کے وقوع کے بغیر خیرِ کلی کا حصول ممکن ہوتا، تو پھر بھی ایک نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اللہ کم از کم حکیم و دانا نہیں ہے کیونکہ کسی ایسے نظام کے نافذ کر سکنے کے باوجود نافذ نہ کرنا آپ کے نزدیک حکمت و دانائی کے فقدان پر دلالت کرتا ہے۔ اور اگر اللہ کی حکمت و دانائی میں کسی قسم کا شک کرنا کفر قرار پائے اور یہی سمجھا جائے کہ اللہ کی حکمت و دانائی ہر قسم کے شکوک سے بالاتر ہے تو پھر بھی ایک نتیجہ نکالنا ہوگا کہ اللہ کسی ایسے نظام (جس میں ان شرور کے وقوع کے بغیر خیرِ کلی کا حصول ممکن ہو) کو نافذ کرنے پر نہ پہلے کبھی قادر تھا، نہ اب ہے اور نہ کبھی ہوگا۔

امید ہے کہ آپ میری اس الجھن کو دور فرمانے کی سعی فرمائیں گے اور کوئی ایسا تسلی بخش جواب عطا فرمائیں گے جس سے کم از کم میرے لیے یہ فیصلہ کرنا سہل ہو جائے کہ آیا اللہ حکیم و دانا ہے، یا قادرِ مطلق، یا یہ کہ اللہ بیک وقت حکیم و دانا بھی ہے اور قادرِ مطلق بھی۔

جواب: آپ کا خط کئی مہینے پہلے مجھے جیل میں ملا تھا۔ مگر وہاں سنسر شپ کی جو غیر معقول اور بیہودہ قیود تھیں ان کی وجہ سے میں نے سرے سے خط و کتابت ہی چھوڑ دی تھی۔ اس لیے دوسرے سینکڑوں خطوط کی طرح آپ کے خط کا جواب بھی نہیں دیا۔ اب یہ مختصر جواب دے رہا ہوں۔

آپ نے جس الجھن کا ذکر فرمایا ہے اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے علم اور اس کی حکمت کے تقاضوں میں مطابقت کے بجائے تناقض تلاش کرنے کی فکر میں پڑ گئے ہیں، اور اس فکر نے آپ کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ان میں سے کسی ایک کا انکار کیے بغیر آپ کے لیے کوئی چارہ نہیں ہے۔ آپ اِس امر واقعی کا انکار تو بہرحال نہیں کر سکتے کہ اس دنیا میں شرور پائے جاتے ہیں شیطان موجود ہے۔ کفر، شرک، دہریت اور دوسری اعتقادی ضلالتیں موجود ہیں۔ قتل و خون ریزی، چوری ڈاکہ، زنا، عمل قوم لوط اور اسی طرح کی بے شمار دوسری اخلاقی خرابیاں موجود ہیں۔ نیکی کے مقابلہ میں بدی کی قوتیں ہر طرف علانیہ کام کر رہی ہیں اور ان کی بدولت طرح طرح کے ظلم رونما ہو رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ خدا ایسا عالم پیدا کرنے پر قادر تھا یا نہ تھا جس میں یہ برائیاں وجود میں نہ آتیں اور ان کے بغیر خیر کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا؟ اگر وہ قادر تھا اور اس نے ایسا نہ کیا تو آپ اسے معاذ اللہ حکمت اور عدل اور خیر سے عاری ثابت کیے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں۔ اور اگر وہ اس پر قادر نہ تھا تو پھر آپ کے طرزِ استدلال کی رو سے وہ لامحالہ عاجز ہی قرار پاتا ہے۔ یہ لازمی نتیجہ ہے منطق کے ایسے استعمال کا جو صفاتِ الٰہی میں تطبیق کے بجائے تناقض تلاش کرنے کی طرف انسان کو لے جائے۔ میں نے اس کے برعکس تطبیق کی کوشش کی ہے اور یہ سمجھانا چاہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ دنیا میں شرور کے پائے جانے سے گھبرانا نہ چاہیے بلکہ اس کی حکمت پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ جب اس نے دنیا کا یہ نظام اس طرح بنایا ہے تو ضرور حکمت کا تقاضا ایسے ہی نظام کی تخلیق ہوگا اور اس کے سوا کوئی دوسرا خالی از شرور نظام بنانا خلافِ حکمت ہوگا۔ میری اس توجیہ سے اگر آپ کا اطمینان نہیں ہے تو آپ دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار فرمائیں۔ یا تو تطبیق کی کوئی دوسری بہتر شکل تجویز کر کے میری رہنمائی کریں۔ یا پھر خدا کے متعلق اس بات کا فیصلہ کر دیں کہ آیا آپ کے نزدیک وہ قدرت سے خالی ہے یا حکمت سے؟

کیا حرام مہینوں کی حُرمت کا حکم اب بھی باقی ہے؟

سوال - قرآن مجید میں اشہرِ حُرُم میں قتال سے منع کیا گیا ہے لیکن شاہ ولی اللہ اور مولانا ثناء اللہ پانی پتی (صاحب تفسیر مظہری) متاخرین میں، اور عطاء اور امام بیضاوی متقدمین میں، بس یہی ملے جنہوں نے آیت کے حکم کو باقی رکھا ہے۔ ان کے علاوہ صاحب بدائع و صنائع زمخشری، جصاص، ابن عربی مالکی اور دوسرے مفسرین اور فقہاء نے اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے حتیٰ کہ کتاب الام میں امام شافعی کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے جب کہ ان کے فقہی اصول (مذکورہ بیضاوی) کی رُو سے اس آیت کو منسوخ نہ سمجھنا چاہیے۔

مجھے جناب سے یہ دریافت کرنا ہے کہ تفہیم القرآن کا مصنف اس مسئلہ میں کیا رائے رکھتا ہے۔ تفہیم القرآن کی خاموشی سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں اس کے بعد درج ذیل باتیں مزید توضیح طلب ہیں:

۱- کیا اس حکم کو اسلامی قوانینِ جنگ میں وہی حیثیت حاصل ہے جو دوسرے قوانین کو حاصل ہے؟

۲- اشہرِ حُرُم میں قتال کی ممانعت کا تعلق صرف اہلِ عرب سے ہے یا دنیا کی ہر اسلامی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس حکم کو پیشِ نظر رکھے؟

۳- تفسیروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشہرِ حُرُم میں قتال سے اس لیے منع کیا گیا کہ خود عربوں میں بھی یہی رسم باقی تھی اور وہ ان محترم مہینوں کا خیال کرتے تھے۔ اگر دنیا کی تمام اسلامی حکومتوں کو اس حکم کا مخاطب سمجھا جائے تو اس کی علت عربوں کی "مخصوص" رسم کے علاوہ کچھ اور بھی ہونا چاہیے۔ وہ کیا ہے؟ قرآن و حدیث میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یا نہیں؟

مجھے جناب کے مشاغل میں دخل اندازی پر ندامت ہے لیکن امید ہے کہ جناب اس

خلش کو (خصوصاً دوسرے نکتے سے متعلق) دور فرمائیں گے

جواب - اشہرِ حُرُم کی حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے پہلے صدہا برس سے عرب میں طوائف الملوکی، بدنظمی اور بدامنی برپا تھی۔ قبائل میں آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ راستے غیر محفوظ تھے۔ کوئی شخص اپنے قبیلے کے حدود سے نکل کر اپنے آپ کو محفوظ نہ پاتا تھا۔ بلکہ کوئی قبیلہ خود اپنے حدود میں بھی کسی طاقت ور قبیلے کا چھاپہ اچانک پڑ جانے سے مامون نہ تھا۔ ان حالات میں کب، کس طریقے سے اللہ کی یہ رحمت عرب قوم پر نازل ہوئی کہ سال میں چار مہینے حرام قرار دے دیئے گئے تاکہ ان میں جنگ اور قتل و غارت گری بند رہے اور لوگ اطمینان سے حج اور عمرہ ادا کر سکیں۔ یہ بات کسی ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکی ہے کہ ان چار مہینوں کو حرام قرار دینے کا یہ قاعدہ کس نے بنایا، کب بنایا، اور کس طرح تمام عرب قبائل نے اسے تسلیم کر لیا۔ بہر حال اسلام سے پہلے صدیوں سے یہ قاعدہ عرب میں رائج تھا اور ہر سال چار مہینے کے لیے امن میسر آجانا اُس بدنصیب قوم کے لیے اللہ کا بہت بڑا فضل تھا۔

اسلام جب آیا تو عہدِ جاہلیت کی تمام اچھی چیزوں کی طرح اس قاعدے کی بھی توثیق کی گئی، کیونکہ اس کی بدولت کم از کم چار مہینے خونریزی کی رہتی تھی، اور حج اور عمرے کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا۔ اور مزید براں ان مہینوں کا احترام اس بات کی علامت بھی تھا کہ جاہلیت میں مبتلا ہونے کے باوجود اہلِ عرب میں کچھ خوفِ خدا باقی ہے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہجرت فرمائی اور مسلمانوں سے کفارِ عرب کی لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اُس وقت بھی ان چار مہینوں کی حرمت کا حکم باقی رکھا گیا، تاکہ کم از کم چار ہی مہینے مسلمانوں کو امن میسر آسکے۔ مگر جب تمام عرب مسلمان ہو گئے تو یہ حکم آپ سے آپ منسوخ ہو گیا۔ کیونکہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد تو اُن پر دوسرا اور عظیم تر حکم یعنی قتلِ مسلم بغیر حق کی حُرمت کا دائمی حکم عائد ہو گیا۔ اب اشہرِ حُرم کی حرمت کا حکم باقی رہنے کے معنی یہ ہوتے کہ اہلِ عرب صرف چار مہینے تو جنگ سے پرہیز کریں باقی ایام میں وہ لڑ سکتے ہیں۔

اس حکم کو جزیرۃ العرب کے لیے۔ اور اس کے بھی صرف آغازِ اسلام کے دور تک کے لیے مخصوص ماننے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ جزیرۃ العرب کے مسلمان ہو جانے کے بعد مسلمانوں کی لڑائیاں جائز طور پر صرف جزیرے سے باہر کے کفار کے ساتھ ہی ہو سکتی تھیں، اور ان لڑائیوں میں صحابۂ کرام کے دور سے لے کر آج تک کبھی اشہرِ حُرم کی حرمت کا سوال کسی عالم نے نہیں اٹھایا۔ ظاہر ہے کہ کفار تو جنگ کی ابتدا کرنے میں اشہرِ حُرم کا لحاظ کر ہی نہ سکتے تھے۔ لیکن خود مسلمانوں نے بھی کسی کافر قوم پر حملہ کرتے ہوئے اس بات کا لحاظ نہیں کیا ہے کہ کسی حرام مہینے میں جنگ نہ چھڑے، اور میرے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ کسی فقیہ نے کبھی اس پر اعتراض کیا ہو۔

مطبوعات

تعلیماتِ غزالیؒ تالیف: مولانا محمد حنیف ندوی۔ شائع کردہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور
صفحات: ۵۰۰۔ قیمت دس روپے۔

مادیت کے اس دور میں جب دین سے لوگوں کی دلچسپی بڑی سرعت کے ساتھ کم ہو رہی ہے اور مادی فوائد و لذائذ نے پوری زندگی کا احاطہ کر رکھا ہے، انسان کی خالص روحانی زندگی میں بھی وہ اخلاص باقی نہیں رہا جو مذہب کا طغرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ آپ اپنی قومی زندگی پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے ہاں عبادات تک کے معاملے میں ایک عام لاپروائی بلکہ بغاوت کے رجحانات ملتے ہیں اور جو قلیل سی تعداد ان کی پابندی بھی کرتی ہے وہ بھی ان سے وہ روحانی کیف و سرور اور وہ دینی فوائد پوری طرح حاصل نہیں کر پاتی جو امت کے صلحاء نے ان سے اخذ کیے ہیں۔

دورِ حاضر میں خدمتِ دین کے جتنے مختلف میدان ہیں ان میں ایک نہایت اہم میدان یہ بھی ہے کہ انسانوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے دلوں کو تعلق باللہ کی حرارت سے گرمایا جائے تاکہ ان کے اندر اخلاص پیدا ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات خصوصاً احیاء علوم الدین بیحد مفید ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی صاحب نے غالباً اسی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے زیرِ تبصرہ کتاب "تعلیماتِ غزالیؒ" مرتب فرمائی ہے۔

اس کتاب کے فاضل مصنف اس سے پیشتر "افکارِ غزالیؒ" اور "سرگزشت غزالیؒ" جیسی دو بلند پایہ کتابیں لکھ کر امام غزالی کے افکار و نظریات کے باب میں اپنی بالغ نظری کا ثبوت پیش کر چکے ہیں۔ یہ کتاب یعنی "تعلیمات غزالیؒ" اسی باب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ مولانا چونکہ قدیم اور جدید فلسفہ پر گہری نظر رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے ایک ایسا اسلوبِ نگارش اختیار کیا ہے جو جدید تعلیم یافتہ طبقے کے قلب و دماغ کو پوری طرح متاثر کرتا ہے۔

کتاب کے آغاز میں انہوں نے ایک بسیط مقدمہ لکھا ہے جس میں تصوف کی ارتقائی منازل کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس کے مختلف پہلوؤں کا بڑی عمدگی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تصوف کی مشہور اصطلاحات مثلاً غیبت و حضور، صحو و سکر، ذوق و شرب، محو و اثبات کی بھی وضاحت فرمائی ہے جن کی مدد سے تصوف کے مباحث کو سمجھنے میں رہنمائی مل سکتی ہے۔ اس مقدمہ کا سب سے زیادہ قابلِ قدر حصہ "تصوف اور اسلام میں اس کا صحیح مقام و موقف" ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی تصریحات قابلِ غور ہیں:

"رہبانیت سے اسلام کو جُدا کرنے والی دوسری چیز یہ ہے کہ اسلام دنیا اور دنیوی خواہشات میں اصولی فرق قائم کرتا ہے۔ دنیا کا مفہوم اس کے نزدیک یہ کارگاہِ حیات ہے اور اس کارگاہِ حیات کو واسطہ اور ذریعہ کے بجائے نصب العین قرار دینا اور اس کی ادنیٰ نعمتوں پر زندگی کی اعلیٰ اقدار کو قربان کر دینا خواہشاتِ دنیا کے مترادف ہے۔ اسلام یا اسلامی تصوف اس کارگاہِ حیات سے تو پوری پوری دلچسپی لیتا ہے۔ مگر اس کو اس کے درجہ سے بڑھا کر نصب العین کے درجہ تک پہنچا دینے کا حامی نہیں۔" (۶۸ - ۶۹)

پھر تصوف کے مقصد پر بحث کرتے ہوئے وہ کتنی صحیح بات کہتے ہیں:

"اگر تصوف کو ایک محرک اعلیٰ اور مؤثر ترین عنصرِ حیات کی صورت اختیار کرنا ہے اور اہلِ دنیا کو آخرت کی طرف مائل کرنا ہے تو پھر اس کی صحیح شکل یہی ہے کہ حضرات صوفیاء اس سابقہ ذوق و رجحان سے دستبردار ہوں اور ایک جیتا جاگتا اور اونچا تصورِ حیات اپنائیں جو دلوں میں اللہ کی محبت پیدا کرے اور دنیا میں خوبصورتی اور توازن کے ساتھ رہنا سکھائے۔" (ص ۹۴)

اس مقدمہ میں البتہ ایک مقام ایسا ہے جسے پڑھ کر ذہن خلش محسوس کرتا ہے۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ "ایک صوفی اور نبی کے درمیان فرق درجہ و مرتبہ ہی کا ہے۔"

فاضل مصنف نے بے شک اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت فرمائی ہے اور اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ "ولی ہزار مجاہدہ و مراقبہ کرے جب بھی نبی یا رسول ہرگز نہیں ہو سکتا" مگر اس کے باوجود وہ اس بات کے قائل ہیں کہ "ان دونوں میں فرق درجہ و مرتبہ کا ہو گا" (ص ۳۳۴)

ہمارے نزدیک یہ صورت صحیح نہیں۔ ایک صوفی کے علوم کا سرچشمہ اس کا قلب ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اُس کی قلبی واردات اور اُس کی داخلی کیفیات، اس کے معارف کا منبع اور مخزن ہیں لیکن نبی کی تعلیمات اُس کی قلبی کیفیات کی شارح اور ترجمان نہیں ہوتیں بلکہ اللہ تعالیٰ خارج سے علوم و معارف اس کے قلب پر القا کرتا ہے۔ اُس کی تعلیمات نہ تو ایک فلسفی کی طرح اُس کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہوتی ہیں اور نہ ہی ایک صوفی کی طرح اُس کے قلبی تاثرات کا اظہار ہوتی ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو پھر نبی کی تعلیمات میں وہ معروضیت (OBJECTIVITY) پیدا نہیں ہو سکتی جسے مولانا نے خود تسلیم کیا ہے۔

اس ضمن میں ایک دوسری گزارش یہ ہے کہ فاضل مصنف سے یہ حقیقت کسی طرح بھی اوجھل نہیں کہ امام غزالی نے اپنے سارے علم و فضل کے باوجود حدیث کے نقل کرنے کے معاملے میں اُس احتیاط کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا جس کی اس باب میں ضرورت ہے اس لیے ضروری تھا کہ وہ احادیث کے حوالہ جات پوری صراحت کے ساتھ درج کرتے۔ یہ ایک بڑی علمی خدمت ہوتی۔

ہمیں اُمید ہے کہ فاضل مصنف طبع دوم کے وقت ہماری ان گزارشات کو نگاہ میں رکھیں گے۔

یہ کتاب اپنی موجودہ صورت میں بھی بڑی مفید اور کارآمد ہے اور اس بنا پر ہم دین سے دلچسپی رکھنے والے حضرات خصوصاً نوجوانوں کو اس کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

اسلام اور مغرب بزبان انگریزی | تالیف: محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ۔ شائع کردہ: شیخ محمد اشرف صاحب کشمیری بازار، لاہور، مغربی پاکستان۔ قیمت: سوا پانچ روپے۔ صفحات: ۱۲۹

اس کتاب کی مصنفہ اُن چند خوش نصیب خواتین میں سے ہیں جو مغرب میں پیدا ہوئیں مغربی

ماحول میں پرورش پائی اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان کی دولت سے نوازا۔ یہ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں اسلامی اور مغربی تہذیب کے تصادم سے پیدا شدہ مسائل پر بڑی فکر انگیز بحث کی گئی ہے بحث میں کہیں بھی تجدّد اور مرعوبیت کا رنگ نظر نہیں آتا۔ یہ چیز محترمہ مریم جمیلہ کی سلامتی فکر اور ایمان کی پختگی کی علامت ہے۔

کتاب کا معیارِ طباعت عمدہ ہے لیکن قیمت بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن۔ اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

"عید کے لئے بہترین تحفہ — پاکیزہ کتب"

معیاری اور پاکیزہ کتب رعایتی قیمت پر لیجئے اور احباب کو تحفہ دیجئے

۱۲ روپے کی کتابیں صرف ۸ روپے میں

۱	الجہاد فی الاسلام مجلد	۱۱-۰۰	۱۶	دین کی باتیں	۲-۰۰
۲	سنت کی آئینی حیثیت آفسٹ	۸-۵۰	۱۷	آپ کیا کریں	۱-۴۰
۳	قادیانی مسئلہ اور اس کے تمدنی اثرات مجلد	۵-۷۵	۱۸	تحریک اسلامی میں کارکنوں کے باہمی تعلقات	۱-۷۵
۴	تحریک آزادی ہند اور مسلمان	۱۰-۰۰	۱۹	معرکۂ دین و سیاست (نعیم صدیقی) اعلیٰ	۳-۵۰
۵	نشری تقریریں مجلد	۲-۰۰		سستا	۳-۰۰
۶	تعلیمات	۳-۲۵	۲۰	اقبال اور نظریہ پاکستان (نعیم صدیقی) اعلیٰ	۱-۷۵
۷	مسئلہ جبر و قدر	۱-۸۰		سستا	۱-۲۵
۸	سفرنامہ ارض القرآن	۴-۷۵	۲۱	اسلام کا فلسفۂ تاریخ	۱-۷۵
۹	امریکہ کا صدارتی نظام	۲-۰۰	۲۲	اسلام اور تھیاکریسی	۲-۰۰
۱۰	نظامِ اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں	۶-۵۰	۲۳	معروف و منکر	۳-۰۰
۱۱	اسلام کا نظامِ عدل	۱۰-۰۰	۲۴	تخریب و تعمیر	۳-۰۰
۱۲	ان دیکھی حقیقتیں	۳-۰۰	۲۵	ماؤزے تنگ کے دیس میں	۳-۰۰
۱۳	بوئے گل (مجموعہ کلام کوثر نیازی)	۳-۵۰	۲۶	کمندیں	۳-۰۰
۱۴	انسان اور اس کے مسائل	۱-۶۰	۲۷	اشتراکیت، مذہب و اخلاق	۱-۶۴
۱۵	مسلمان کے روز و شب	۳-۲۵	۲۰	ٹھنڈی آگ	۳-۰۰

◉ مندرجہ بالا کتب میں سے کوئی بھی ۱۲ روپے کی کتابیں منتخب کر لیجئے
آپ کو صرف ۸ روپے میں ملیں گی ۔ ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہوگا ۔

◉ یہ رعایت ۲۸ فروری ۱۹۶۶ء تک موصول شدہ فرمائشوں پر دی جائے گی ۔

آج ہی اپنی فرمائش منسلکہ کارڈ پر لکھ کر بھیج دیجئے تاکہ آپ
اس رعایت سے محروم نہ رہیں

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور
فون ۶۸۳۴۱

رجسٹرڈ ایل: ۸۳۴۰